خدا بخش لائبریری جرنل





خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل



خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۱۹۷۸ء

چوتھا شمارہ: ۱۹۷۸ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے۔ جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں۔ یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت: پندرہ رُپے

محبوب حسین نے اُردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس رمنا لین پٹنہ ۴ - اور انگریزی حصہ تارا پریس، ترپولیہ، پٹنہ میں
چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

فہرست

میری تنقید — ایک باز دید	از پروفیسر کلیم الدین احمد	۱
رسالہ ادیب (فروز آباد) — ایک جائزہ	از ڈاکٹر عابد رضا بیدار	۷۳
مراسلہ : دربارۂ مکتوب ابوالکلام آزاد	از جناب محمد یونس خالدی	۱۰۳
تصحیح و اضافہ : دیوان حافظ	از جناب قاضی عبدالودود	۱۰۴
مطبوعات جدیدہ : فرہنگ آصفیہ (۳)	از جناب قاضی عبدالودود	۱۰۵
خدا بخش لائبریری کو مصنفین کے تحفے (مطبوعات تازہ)		۱۱۳
نوادر : لائبریری کے وزیٹر رجسٹر سے ماخوذ عکسی تحریریں [سی۔ وی۔ رمن (سائنسداں) ؛ جگدیش چندر بوس (سائنسداں) ؛ جان سائمن (چیرمین سائمن کمیشن) ؛ اور مارٹیمر وھیلر (ماہر آثار قدیم)]		۱۱۵

اسلامی تقویم کی بازیافت (انگریزی)	از ڈاکٹر ہاشم امیر علی	۱

ہمارے مقالہ نگار

پروفیسر کلیم الدین احمد (بی۔اے (کینٹب) سری کرشنا پوری، پٹنہ (پ ۱۹۰۹ء)

(تفصیل کے لئے ص ۷۱-۷۲)

ڈاکٹر ہاشم امیر علی، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، حیدرآباد (پ ۱۹۰۳ء)

—— دیہی عمرانیات پر شکاگو یونیورسٹی سے پی۔ایچ ڈی؛ جامعہ ملیہ اسلامیہ دیہی انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر؛ نظام حیدرآباد کے نجی اور مذہبی اوقاف کے متولی؛ قرآن اور عمرانیات پر متعدد کتابوں کے مؤلف، مثلاً: قرآن؛ طلبہ کے لئے ایک تعارف (انگریزی)؛ نزولی تفسیر: قرآن مجید کا نزولی ترتیب کے ساتھ ترجمہ (انگریزی)؛ میوات کے میو لوگ (انگریزی)

جناب محمد یونس خالدی

—— سکریٹری، آزاد میموریل اکادمی، بشیشر ناتھ روڈ، لکھنو۔

بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو، جرنل، ۱، ۱۹۷۷ء

سلسلہ خدابخش خطبات ۱۰

میری تنقید

ایک بازدید

کلیم الدین احمد

خدابخش توسیعی خطبات — ۱۹۷۸ء

سال طباعت — ۱۹۷۸ء

خدابخش لائبریری میں پچھلے چند برسوں سے خدابخش سالانہ خطبات کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ ۱۹۷۷ء سے خدابخش توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ مزید شروع ہوا ہے، جس میں علوم اسلامیہ کے علاوہ اُردو ادب اور تاریخ ہند کے فاضلوں کے لکچر ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں اس کے لئے پروفیسر کلیم الدین احمد منتخب ہوئے۔

محبوب حسین نے پٹنہ لیتھو پریس رمنا لین پٹنہ ۴ میں چھپوا کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا



گالز ورذی نے لکھا ہے کہ کسی جگہ لوگ نہایت آرام و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے کہ ایک صاحب کو خبط سوار ہوا۔ آپ نے ایک لالٹین لے کر شہر کی سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں ٹہلنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سڑکوں اور گلیوں پہ ہر جگہ گندگیاں نظر آنے لگیں۔ اس حرکت سے لوگ بہت خفا ہوئے اور خفا ہونا فطری تھا۔ جہاں انہیں صفائی نظر آتی تھی اب گندگی نظر آنے لگی۔ حُسن کی جگہ بدنمائی نے لے لی۔ جس شہر کو وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر سمجھتے تھے وہ بدنمائی اور گندگی کا گہوارہ نکلا۔ ہاں تو ان لوگوں کا خفا ہونا برحق تھا۔ بھلا یہ کسی سمجھ دار شخص کا کام تھا کہ اس حسین اور مصفا شہر میں گندگی پھیلائے۔ اس کو پکڑ کر لوگ قاضی کے پاس لے گئے، تو اقبال جرم کے عوض فرمانے لگے۔ "میں بے قصور ہوں اور یہ لالٹین بھی بے قصور ہے۔ میں تو صرف لالٹین لے کر شہر میں چکر لگاتا ہوں۔ لالٹین کی روشنی سڑکوں پر پڑتی ہے، تاریک گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ اب اس روشنی میں گندگیاں جو پہلے سے موجود ہیں نظر آنے لگیں تو اس میں میرا یا اس لالٹین کا کیا قصور ہے۔" تنقید اسی قسم کی لالٹین ہے۔ اس کی روشنی شہرِ ادب کے قصروں، گلستانوں اور اس کی سڑکوں، گلی کوچوں پر پڑتی ہے اب اگر اس روشنی میں گلستاں خارزار ٹھہرے اور قصر کھنڈر نظر آئے، اور سڑکوں اور گلی کوچوں میں گندگیاں نظر آنے لگیں تو قصور شہرِ ادب کا ہے یا تنقیدی روشنی کا۔ میری تنقید اسی قسم کی لالٹین ہے۔

بہر کیف میری تنقید کی ابتدا 'گل نغمہ' کے مقدمے سے ہوئی۔ 'گل نغمہ' میرے والد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ میں اسکول ہی میں تھا جب میں نے ان نظموں کو پڑھا تھا اور نقل بھی کر لیا تھا۔ جب میں انگلینڈ گیا تو یہ نظمیں میرے ساتھ تھیں۔ میں نے چاہا تھا کہ ان نظموں کو لندن سے شائع کر دوں۔ چنانچہ میں نے FOYLE'S (لندن کے مشہور کتب فروش اور پبلشر) کو ان نظموں کا مسودہ دکھایا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے میں انہیں شائع نہ کر سکا۔ لیکن یہ نظمیں میری ہمدم رہیں۔ پھر ۱۹۳۸ء میں اس طرف دھیان گیا۔ میں نے ان نظموں کی از سرِ نو ترتیب کی، ایک بسیط مقدمہ لکھا اور اشارات کا اضافہ کیا اور ان سب چیزوں کو کاتب کے حوالہ کر دیا۔

ان کو کاتب کے حوالے کر کے میں نے "اُردو شاعری پر ایک نظر" کی ابتدا کی۔ اِدھر نظموں کی کتابت ختم ہوئی اور اُدھر 'اُردو شاعری' کی کتابت شروع ہوئی۔ اسی لئے 'گل نغمہ' ۱۹۳۹ء میں نکلی اور 'اردو شاعری' اوائل ۱۹۴۰ء میں۔ "گل نغمہ" کے مقدمے پر بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں۔ حالانکہ مقدمہ بالکل معروضی تھا۔ اس مقدمے کے دو حصے تھے۔ ایک اُردو شاعری سے متعلق تھا اور دوسرا ان نظموں سے۔ دونوں حصے معرض بحث بنے اور بہت سی باتیں جو کہی گئیں وہ غیر متعلق تھیں۔ مثلاً یہ کہ میں انگریزی کا پروفیسر ہوں مجھے اُردو ادب سے کیا واسطہ؟ میں نے اُردو کب پڑھی، مجھے اُردو شاعری کا علم نہیں؛ مجھے ان نظموں پر مقدمہ خود نہیں لکھنا چاہئے تھا، کسی سے لکھوا لینا چاہئے تھا۔

مجھے ان نظموں سے اس لئے دلچسپی تھی کہ میرے خیال میں وہ صحیح معنوں میں نظمیں تھیں۔ ان میں تسلسل تھا، ارتقائے خیال تھا، ابتدا وسط اور انتہا میں ربط تھا یعنی ان میں وہی چیزیں تھیں جو مغربی نظموں کا طرۂ امتیاز ہیں اور پھر خلوص بھی۔ یہ نظمیں انگریزی نظموں کے زیر اثر لکھی گئی تھیں اور زبانی لغزشوں کے باوجود یہ نظمیں تھیں، مسلسل غزلیں نہ تھیں، غیر مربوط نظمیں نہ تھیں۔ پھر یہ نظمیں بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھی گئی تھیں۔ جب انگریزی کے زیر اثر نظمیں لکھی جانے لگی تھیں لیکن ان میں عموماً نظم کی امتیازی خصوصیتیں نہ تھیں اور یہ ان نظموں کی تاریخی اہمیت ہے اور اگر آپ تعصب کی عینک اُتار کر ان نظموں کو پڑھیں ـــــ وہ نظمیں جو گل نغمہ کے پہلے حصہ 'رقص بسمل' میں ہیں تو آپ کو کبھی کبھار زبانی لغزشوں، محاوروں کی غلطی کے باوجود نظم کا صحیح پیکر ملے گا اور جس نے 'اپنی تلاش میں' دیکھی ہے اس نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ میں نے اپنے خاندان اور اپنے رشتہ داروں سے متعلق نہایت صاف گوئی سے کام لیا ہے۔

محمود علی خاں صبا نے لکھا ہے۔ "انہوں نے 'اپنی تلاش میں' جس ہمت، جرأت اور بیباکی کے ساتھ جو کچھ اپنے خاندان اور اپنے ماحول کے متعلق لکھا ہے اسے ان کا شدید سے شدید مخالف بھی شاید لکھنے سے گریز کرتا" قابل غور بات یہ ہے کہ کیا 'گل نغمہ' کی اشاعت کے وقت یہ ہمت، جرأت اور بیباکی ہوا ہو گئی تھیں۔

آج میں نے اس مقدمے کا پہلا حصہ تقریباً ۳۷ سال کے بعد پڑھا یہ حصہ ۱/۲ ۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جو کچھ میں نے ان چند صفحوں میں کہا تھا اسی کی تفسیر و تشریح میری کتابیں، خصوصاً 'اُردو شاعری'، 'اُردو تنقید' اور 'عملی تنقید' ہیں اور مجھے خوشی ہوئی کہ میں ایک صراط مستقیم پر چلتا رہا، کبھی اس سے سر مو تجاوز نہیں کیا۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ دیکھئے

اسی مقدمے میں وہ رسوائے عالم جملہ میرے قلم سے نکلا تھا: غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے، اس پر ایک شور و غوغا اٹھا تھا گویا میری زبان سے کفر کا جملہ نکل گیا تھا اور آج بھی یہ جملہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ میں نے چند جملوں میں اس کی تشریح بھی کر دی تھی: وہ جملے سنئے:

"ربط، اتفاق، تکمیل یہی تہذیب کا سنگ بنیاد ہیں اور ان سے غزل بالکل مبرا ہے۔ ہر شعر مکمل ضرور ہوتا ہے لیکن غزل میں چند مختلف المعنی اشعار اکٹھا کر دیئے جاتے ہیں جن سے یہ اثر زائل ہو جاتا ہے اور ذہن و ادراک پر کسی مکمل تجربے کی تصویر نقش نہیں ہوتی بلکہ چند بے ربط نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں جن سے تہذیب یافتہ دماغ کو لطف نہ تربیت یافتہ تخیل کو سرور ممکن ہے۔"

ذرا موضوع سے ہٹ کر میں یہ بتا دوں کہ میں نے یہ جملہ تیس ۳۰ سال کی عمر میں لکھا۔ میں ان لکھنے والوں میں نہیں ہوں جو 'کاتا اور لے دوڑی'، کہے جانے کے مستحق ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ وسیع مطالعہ اور برسوں کے غور و فکر کے بعد۔ یہ خیال بھی درست نہیں کہ میری مشرقی ادب سے واقفیت نہیں ہونے کے برابر تھی جب مجھے انگلستان بھیج دیا گیا اور اسی لئے مغربی چھاپ اس قدر گہری پڑی۔ میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ لکھنے سے پہلے میں ایک شہادتوں کا محضر پیش کروں جن میں میرے qualifications کی تفصیل ہو۔ جس نے 'اپنی تلاش میں'، پڑھی ہے وہ کم سے کم یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مشرقی ادب سے میری واقفیت نہیں ہونے کے برابر تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بچپن سے مشرقی ادب میرا اوڑھنا بچھونا رہا اور اب بھی ہے، لیکن اسے کیا کیجئے کہ بقول اقبال

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش   خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

آمدم بر سر مطلب ۔ تو غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل میں نے اردو شاعری کے تیسرے اڈیشن میں کر دی تھی لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ جملہ پڑھ کر لوگ ایسا بدک جاتے ہیں کہ وہ آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس صورت حال کا الزام بھی بر سر غزل ہے۔ غزل نے افتاد طبیعت ایسی بنا دی ہے کہ ایک شعر، ایک مصرع، ایک فقرے پر ہی توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور آگے نہیں بڑھ پاتی۔ لیکن تنقید غزل نہیں، یہاں توجہ کو آگے بڑھنا ہے۔ یہ سوچنا ہے کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے تو کیوں ہے اور نیم وحشی کا کیا مفہوم ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میں نے ساری باتیں کہہ دی ہوتیں اور نیم وحشی کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو ردعمل کیا ہوتا۔ آخر میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ حالی نے کہا تھا: "غزل میں جیسا کہ معلوم ہے

کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ اِلّا ماشاء اللہ بلکہ جدا جدا خیالات الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔" طباطبائی نے کہا تھا: "ستم کی بات تو یہ ہے کہ شاعرِ غزل گو کسی مضمون کے کہنے کا قصد ہی نہیں کرتا۔ جس قافیے میں جو مضمون اچھی طرح بندھتے دیکھا اس کو باندھ لیا۔ ایک شعر میں بت پرستی ہے، دوسرے میں توحید و عرفان۔ ابھی ناقوس پھونک رہے تھے، اس کے بعد ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ۔ ۔ ۔ میں خود بھی غزل کہتا ہوں اور رسم زمانہ کے مطابق ایسے ہی بے سروپا مضامین باندھ لیا کرتا ہوں مگر انصاف یہ ہے کہ جس کلام میں ایسا تناقض و تہافت ہو اس میں کیا اثر ہوگا؟" اور عظمت اللہ خاں نے کہا تھا: "فرض کیجئے ایک آپ کے معقول، مقطع، تعلیم یافتہ دوست آپ سے اس گونا گونی سے گفتگو کریں۔ ایک جملے میں اپنی معشوق کے لبِ لعلین کا ذکر کریں، دوسرے میں حور و قصور کا بیان ہو، ایک میں زاہد پر بھونڈا فقرہ کسیں، دوسرے میں تصوف کی ترنگ میں کوہ طور پر خدا کا جلوہ دیکھیں، غرض اس طرح بے ربط خیالات کا طومار باندھ دیں۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا آپ ان صاحب کو یہ سمجھیں گے کہ وہ اپنے آپ میں ہیں؟

ہاں تو میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میں نے 'نیم وحشی' کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو شاید اتنا شور و غوغا نہ مچتا لیکن مجھے ایسا لگا کہ ان لوگوں کو غزل کی خامیوں کا ادھورا احساس ہے اسی لئے میں نے سوچا کہ بات دو ٹوک کہہ دی جائے۔

غزل کے شعروں میں ربط نہیں، غزل میں ارتقائے خیال نہیں، غزل میں کوئی مکمل تجربہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے کیونکہ وحشی اپنے جذبات کے وجود کو ان کے وجود کی کافی وجہ سمجھتا ہے۔ احساس و اعمال کو وہ غور و فکر پر ترجیح دیتا ہے اسی لئے اپنے آرٹ میں وہ مواد کی زیادتی اور شوکت پر زور دیتا ہے۔ اسے اپنی تشفی کے لئے آپ a series of climaxes کہہ لیں۔ جزئیات کے حسن کو تو وہ سمجھ سکتا ہے، لیکن صورت، فورم کے حسن اور تکمیل سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے' اردو شاعری'۔ جو سوالات میں نے اٹھائے ان کا آج تک کسی نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ کہا تو بس اسی قدر کہ غزل تو کلچر و تہذیب کی انتہائی پختگی کی پیداوار ہے۔ کسی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کی کہ غزل میں حسن صورت ہے غزل میں ارتقائے خیال ہے۔ غزل میں مکمل تجربہ ہے۔ غزل میں حسن صورت ہے تو اسی قدر کہ سب شعروں کی بحر ایک ہوتی ہے۔ ردیف و قوافی کی پابندی ہوتی ہے پھر مطلع و مقطع کی بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی صورت ہے۔ رہا ارتقائے خیال یا مکمل تجربہ تو وہ کسی دوسری دنیا کی چیز ہے۔ پھر بھی اصرار ہے کہ اردو شاعری کی لاج غزل نے رکھ لی اگر ایسا ہے تو۔ ۔ ۔

آپ جملے کو ختم کرلیں۔

غزل کو نیم وحشی صنف شاعری کہیں یا نہ کہیں لیکن اب یہ احساس عام ہو چلا ہے کہ غزل میں صنفی خامیاں ہیں اور میں نے مضامین غزل کی یکسانی سے زیادہ ان صنفی خامیوں پر زور دیا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ سرور صاحب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ میں نے غزل کی صنفی خامیاں بتائی ہیں اور یہ خامیاں واقعی ہیں، خیالی نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:
"غزل کے جواز میں جاپانی شاعری ہائیکو کی مثال دی جاتی ہے۔ کلیم الدین نے واضح کیا ہے کہ" ہر ہائیکو شعر کی طرح بجائے خود آزاد اور مکمل اکائی ہے اور آزاد اور مکمل اکائیوں کا ایک جگہ اکٹھا کرنا (جس طرح غزل میں کیا جاتا ہے) تحصیل حاصل ہے"۔ اسی طرح کسی صاحب نے لکھا ہے کہ" غزل کی صورت کچھ ایسی ہے کہ غزل گو شاعر بڑا شاعر نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی زبان کی بہترین شاعری اس کی غزلیہ شاعری ہے تو یہ اس زبان کی تہی مایگی کا ثبوت ہے"۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اردو شاعری کی لاج کہاں رہی۔

اکثر لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ اب آپ کی غزل سے متعلق کیا رائے ہے۔ سرور صاحب نے بھی کسی جگہ لکھا ہے کہ میری مخالفت میں اب وہ شدت نہیں رہی۔ دوسرے حضرات سمجھتے ہیں کہ نئی غزلوں کو پڑھ کر میں نے اپنی رائے بدل لی ہوگی۔ جہاں تک سرور صاحب کی بات کا سوال ہے میں نے غزلوں کی مخالفت نہیں کی تھی، صنف غزل کی خامیوں پر روشنی ڈالی تھی اور اردو شاعری کے تیسرے اڈیشن میں میں نے اس تفصیل سے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے کہ میں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ رہے دوسرے حضرات تو مجھے ان کی معصومیت پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ مضامین غزل بدل گئے، اور بدلتے آئے ہیں لیکن غزل نہیں بدلی ہے۔ میں نے اقبال کی غزلوں پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ان غزلوں میں مضامین نئے ہیں اور چونکہ اقبال کے خیالات ایک نہج پر بہتے ہیں اس لئے ان میں تسلسل نظر آتا ہے۔ دور حاضر کی غزلوں میں مضامین نئے ہیں اور کبھی کبھار شعروں میں تسلسل بھی نظر آجاتا ہے لیکن غزل آج بھی غزل ہے۔ اس کی صنفی خصوصیات وہی ہیں جو اگلے زمانوں میں تھیں۔ اس لئے اس میں بھی وہی صنفی خامیاں ہیں۔ یعنی آج بھی غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔

میں نے قارئین کی اشک شوئی کے لئے انگریزی شاعر براوننگ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ وہ نظمیں لکھتا ہے، غزلیں نہیں لیکن اس کی نظموں کو بھی Santayana نے نیم وحشی کہا ہے اور انگلستان میں اس اعتراض پر کوئی شور و غوغا نہیں مچا۔ کیونکہ وہاں غور و فکر کی عادت ہے، وہاں غزل کی عالمگیری کی وجہ سے ریزہ خیالی نہیں آئی ہے۔ وہ ایک جملے کو متن سے علاحدہ کر کے اس پر واویلا نہیں مچاتے۔ پھر وہ کسی شاعر یا کسی صنف شاعری

کو پاک اور منزہ نہیں سمجھتے۔ اسے بُت بنا کر اس کی پوجا نہیں کرتے۔ وہ آذری نہیں کرتے۔ پھر میں نے قارئین کی اشک شوئی کے لئے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں نے غزل کو نیم وحشی صنف شاعری کہا ہے۔ غزل گو شعراء کو نیم وحشی نہیں کہا ہے۔ غزل گو شاعر مہذب ہو سکتا ہے البتہ جب وہ صنف غزل میں اس کے مخصوص اوصاف کے ساتھ طبع آزما ہوگا، تو نتیجہ ایک نیم وحشی کارنامہ ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ غزل مسلسل ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اور میں نے مثالیں بھی دی تھیں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ غزل نظم بھی بن سکتی ہے اور اس کی مثال بھی دی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں اَن سُنی کر دی گئیں۔ جیسے میں نے "غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے" کے علاوہ کچھ اور لکھا ہی نہیں۔

بہرکیف جیسا کہ میں نے کہا ہے مخالفت کے باوجود میری باتیں مان لی گئی ہیں۔ میں دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

"ریزہ خیالی اچھی ہو یا نہیں ایک حقیقت ضرور ہے۔ یقیناً ایسا شاعر کس مصرف کا جو ایک ہی غزل یا نشست میں کبھی ہجر میں مبتلا ہے کبھی وصل سے بہرہ مند، کبھی دنیا کے فانی ہونے کا ذکر کرتا ہے، تو کبھی عیش کوشی کی تلقین کرنے لگتا ہے۔"

یہ تھی پہلی مثال، اب دوسری مثال ملاحظہ ہو:

"غزل گو شاعر انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہے مگر ان سے کوئی بڑا کام نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بکھری ہوئی تجلیوں اور پسی ہوئی بجلیوں کا قائل ہے۔ غزل کے نشتروں سے ایک لطیف خلش پیدا ہوتی ہے اور اس سے کام لیا جاتا رہا ہے، ابھی اور بھی لیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ نشتر تلوار نہیں بن سکتے۔ غزل کی زبان بڑی ڈھلی منجھی ہوئی چیز ہے۔ مگر اس میں انفرادیت کو پھولنے پھلنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی رمزیت خاصی جامع اور گہری ہے۔ مگر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں زیادہ عرصے تک کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے۔"

یہ پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کا دور ہو یا نہ ہو، لیکن میں پھاوڑے کو پھاوڑا کہنا پسند کرتا ہوں باغبانی آلہ نہیں کہتا۔ اسی لئے بکھری ہوئی تجلیوں اور پسی ہوئی بجلیوں کے عوض میں غزل کو نیم وحشی صنف شاعری کہتا ہوں۔

غزل چند شعروں سے مرکب ہوتی ہے اور ہر شعر بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ میں نے "گل نغمہ" کے مقدمہ میں لکھا تھا:

"ہر شعر بجائے خود مکمل سہی لیکن اس کی تکمیل بھی نامکمل ہے۔ اگر نظم کو مجسمہ سے تشبیہہ دی جائے، تو شعر مفرد کی مثال محض ایک عضو کی سی ہے۔ مجسمہ مکمل ہے۔ عضو بذات خود مکمل ہو لیکن مجسمے کے مقابلے میں، نامکمل ہے۔ شعر مفرد بھی مثل غزل شاعری کا نیم وحشی عنصر ہے۔"

یہی بات کسی قدر وضاحت سے اُردو شاعری میں کہی گئی ہے:

"غزل سے قطع نظر اگر ہر شعر کو ایک مکمل نظم تصور کیا جائے، تو شعر پر بھی نیم وحشی صنف شاعری ہونے کا الزام عائد ہوگا۔۔۔ وحشی اپنے ہر شعر میں کسی وقتی احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور اس ترجمانی سے اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔۔۔ وہ نہ غور و فکر کرتا ہے اور نہ غور و فکر اس کے بس کی بات ہوتی ہے۔ وہ محض اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر اس سے فوری نجات چاہتا ہے اور یہ نجات وہ شعر کی شکل میں حاصل کرتا ہے۔۔۔ (اس لئے) اگر شعر مفرد کو نظم کی طرح مکمل سمجھا جائے اور اس کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا آلہ بنایا جائے تو یہ بھی ایک نیم وحشی صنف شاعری ہوگا اور کسی تہذیب یافتہ دماغ کو اس سے پوری تسکین نہیں مل سکے گی۔"

کہا جاتا ہے کہ ہر شعر میں ایک جہان معانی پنہاں ہوتا ہے، اِس چھوٹے سے کوزے میں بحرِ ذخّار موجیں مارتا ہے۔ میں نے غالب کے آرٹ کی یہ خصوصیت بیان کی ہے:

"غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات و جذبات یا ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے۔ لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان دوسری باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے، گویا شبستانِ خیال کا دروازہ کھُل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔ اگر آپ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیجئے، تو ممکن ہے کہ دریا کی سطح پر آپ کو کامل سکون نظر آئے۔ پھر ایک پتھر کا ٹکڑا اٹھا کر پھینک مارئیے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہوگی۔ یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی۔ لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا، ایک بھنور کی سی کیفیت نمایاں ہوگی اور یہ لہریں پھیلتے پھیلتے نظروں سے غائب ہو جائیں گی۔ غالب کے اشعار دریائے تخیل میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔"

مجھے کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ کسی نے "اُردو شاعری" پڑھی نہیں۔ ابتدا ضرور کی لیکن یہ جملہ پڑھتے ہی کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے، قارئین کچھ اتنے غضبناک ہو جاتے ہیں کہ وہ کتاب کو فوراً بند کر کے شلف

پر رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے کبھی نہ پڑھنے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ غزل کے شعروں کی رمزیت، ایمائیت وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے لیکن کسی نے شاید ہی اتنی وضاحت کی ہے۔ "گویا محشرستانِ خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور شعر اس دروازے کی کلید ہے۔۔۔ اشعار دریائے تخیل میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔" یہ سب ہی لیکن میں شعر کو نظم کیسے کہوں۔ شعر چاول پر قُل ھُوَاللہ لکھنے کا فن ہو، شعر miniature painting ہو، لیکن شعر نظم نہیں۔

ایک بار میں علیگڑھ گیا ہوا تھا۔ خواجہ منظور حسین نے مجھے چائے پر بُلایا، پھر چائے کے بعد اپنے خانہ باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ پھر وہی شعر و غزل کی بات نکل آئی۔ کہنے لگے ایک شعر کئی نظموں پر بھاری ہے۔ ایک شعر میں اتنے معانی ہوتے ہیں کہ آپ کو کئی نظموں میں نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا: خواجہ منظور صاحب آپ تو انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ ورڈز ورتھ کی نظم A slumber did my spirit seal کو نہ جانے آپ نے کتنی بار پڑھا اور پڑھایا ہو گا۔ جو معانی اس میں ہیں وہ آپ دو مصرعوں میں کہہ دیجئے۔ آپ سب حضرات جانتے ہوں گے۔ وہ نظم یہ ہے:

A slumber did my spirit seal,
I had no human fears,
She seemed a thing that could not feel
The touch of earthly years.

No motion has she now, no force,
She neither hears no sees;
Roll'd round in earth's diurnal course
With rocks and stones and trees.

خواجہ منظور صاحب تو خوش لبے لیکن یہ صلائے عام ہے۔ یاران نکتہ داں ہوں یا نہ ہوں۔
اسی طرح میں نے اردو شاعری میں پول لین کی 'Arietbe' تھیو فیلی گوتی ایر کی 'La der-niere Feuilla' اور سلی پرودوم کی 'Ici-bas' کا حوالہ دیا ہے۔ یہ نظمیں بھی دو مصرعوں میں سما

نہیں سکتیں حالانکہ یہ بہت سادہ ہیں، ان میں زیادہ پیچیدگی نہیں، محشرِ خیال نہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ کیٹس کی 'ode to a Nightingale' کو یا شیلی کی 'ode to the west wind.' کو دو مصرعوں میں کہہ دیجئے تو پھر کیا ہو۔ 'گنجینۂ معانی، محشرِ خیال، شعر کئی نظموں پر بھاری ہے۔ یہ سب معاف کیجئے گا زبانی جمع خرچ ہے اور کچھ نہیں۔ شیکسپیئر کی مشہور سطریں ہیں:

Tomorrow and tomorrow and tomorrow
creeps in this petty pace from day to day
To the last syllable of recorded time;
And all our yesterdays have lighted fools
The way to dusty death. out, out, brief candle!
Life's a walking shadow, a poor player
That struts and frets his hour upon the stage
And then is heard no more. It is a tale
Told by an idiot full of sound and fury
signifying nothing.

آپ حضرات شاعر بھی ہیں، انگریزی اور اردو زبانوں سے جانکاری بھی رکھتے ہیں۔ اگر آپ ان معانی کو دو مصرعوں میں بیان کر دیں تو میں اپنا اعتراض واپس لے لوں۔ یہ ممکن نہیں۔ اس لئے مجھے اقبال کے لفظوں میں تبصرہ یک لفظ کہنے دیجئے۔ 'دعویٰ بجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور' — اور مجھے سنیتا نا کے لفظوں میں یہ بھی کہنے دیجئے۔ دو مصرعوں میں تکمیل نہیں۔ وضاحت نہیں، وہ چھوٹے چھوٹے دھڑ ہیں جو ٹوٹے ہوئے بنائے گئے ہیں اس لئے کہ پڑھنے والے بازوؤں اور ٹانگوں کی کمی کو پورا کریں۔ ان دو مصرعوں میں ستائش کے لائق جو چیزیں ہیں، وہ یہ ہیں: فقروں کی معنی خیزی، جوش و احساس کی تیز چمک، مشاہدے کے ٹکڑوں کا انبار، کبھی کبھار نور کی جھلک اور شعریت کا حسن یہ سب ہی۔ لیکن ایسی کوئی چیز نہیں، جو خالص حسن کے روح میں جذب ہو کر لکھی گئی ہو، جو خلوص کے ساتھ تکمیل کو پہنچائی گئی ہو، جو سادہ اور قطعی طور پر درست ہو۔

اس لئے میں شعر کو نظم نہیں کہہ سکتا۔ میں نے "گل نغمہ" کے مقدمے میں لکھا تھا "شاعر کسی واردات قلبی، کسی تصور داخلی، یا کسی مشاہدۂ خارجی کا انکشاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی نظم بعد تکمیل صرف ایک جذبہ یا ایک خیال کا خاکہ نہیں کھینچتی۔ ایک جذبہ دوسرے جذبات کو ابھارتا ہے، ایک خیال دوسرے خیالات کی تحریک کرتا ہے، ایک نقش ظاہری دوسرے نقوش کی یاد تازہ کرتا ہے، ایک لفظ دوسرے الفاظ کی مثل مقناطیس کشش کرتا ہے۔ اس طرح جو تجربہ شاعر ایک نظم میں پیش کرتا ہے وہ مختلف احساس و تفکرات کا مجموعہ، مختلف نقوش و الفاظ کا گلدستہ ہوتا ہے"۔ یعنی نظم میں (۱) تجربہ پیچیدہ ہوتا ہے، مختلف جذبات و خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ (۲) اس میں نقوش بھرپور ہوتے ہیں (۳) بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہوتی ہے (۴) ارتقائے خیال ہوتا ہے، یعنی ابتدا، وسط اور انتہا میں ربط کامل ہوتا ہے۔ (۵) حسن مکمل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیتیں نہ تو غزل میں ملتی ہیں اور نہ شعر میں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ بلاغت کا تصور کیجئے تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی، سارے اعتراضات مہمل ثابت ہوں گے اور کسی تنقید کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اگر بلاغت میں یہی جادو تھا تو مولانا روم کی مثنوی نہ ہوتی اور نہ فردوسی کا شاہنامہ اور نہ کوئی اردو شاعر قصیدہ، مثنوی، مرثیہ یا نظم کی طرف توجہ کرتا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزل پر اعتراض کرنے سے پہلے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، معاشی، روایتی، لسانی وغیرہ وغیرہ پس منظر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ غزل فارسی سے اردو میں آئی جیسے قصیدہ اور دوسری صنفیں آئیں۔ یہ محض اردو شعرا کی تن آسانی تھی کہ انہوں نے آسان ترین صنف کو اپنایا، اسی پر اپنا سارا ذہنی سرمایہ صرف کر دیا اور جو ذہنی سرمایہ تھا وہ دوسری صنفوں کے لئے ناکافی تھا۔

غزل سے متعلق اردو شاعری میں صرف چند صفحے ہیں۔ پہلے حصے میں تفصیل سے چھ شعرا کا ذکر ہے: میر، سودا، درد، ایک طرف تو مومن، ذوق، غالب دوسری طرف اور ان شعرا کی بھرپور تعریف بھی کی ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں میں نے ان کی خوبیوں کا بیان کیا ہے وہاں ان کی خامیوں یا حدود پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ Potentially یہ شعرا بزرگ شعراء ہو سکتے تھے اگر وہ نظمیں لکھتے۔ پھر میں نے ان کے شعروں کے حسن، ان کی لطافت، ان کی زود اثری پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اگر میں سمجھتا کہ یہ صنف بالکل مہمل اور تضیع اوقات ہے تو میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔ البتہ میں نے اس قسم کی شاعری کی تنگ دامانی کا گلہ کیا ہے۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے "کچھ اور چاہیئے وسعت..." الخ

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ میں نے ایک حصہ قطعہ کے لئے وقف کر دیا ہے اور اس کے امکانات اور حسن کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔ غالب کے مشہور قطعہ جس کا پہلا مصرع ہے: "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کا تفصیلی تجزیہ کر کے اس کی خوبیوں کی وضاحت کی ہے اور قطعہ کے ساتھ مسلسل غزل کے حسن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ دو غزلوں کا کچھ تفصیل سے تجزیہ کیا ہے ایک غزل آتش کی ہے: "شبِ وصل تھا چاندنی کا سماں تھا" اور دوسری نظیر اکبر آبادی کی: "یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے باآب و تاب"۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے غزل کے ساتھ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کہیں ناانصافی نہیں کی ہے۔

"اُردو شاعری پر ایک نظر" میں غزل کے علاوہ اور صنفیں بھی ہیں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ان کی بھی صنفی خامیوں پر روشنی ڈالی ہے اور نمائندہ شعراء پر تفصیل سے لکھا ہے لیکن ان باتوں کے خلاف اتنا شدید ردِ عمل نہیں ہوا جتنا غزل پر ایک جملہ لکھ دینے سے۔ مرثیہ سے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی کچھ شکایت البتہ ہوئی ہے، لیکن پھر بھی ان شکایتوں کا وہ طومار نہیں جو غزلوں سے متعلق ہے حالانکہ مجھے خیال تھا کہ اس کے خلاف زیادہ شدید ردِ عمل ہوگا کیونکہ یہاں مذہبی جذبات کا سوال تھا، مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنے کا سوال تھا اور میں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ صرف مرثیہ کی شعری خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی جائے اور شاید میں اس میں کامیاب بھی ہوا لیکن میں نے مرثیہ کی دو اہم صنفی خامیوں کو واضح کیا۔ ایک تو یہ کہ مرثیہ Elegy بھی ہے اور پھر رزمیہ یعنی Epic بھی اس لئے اسے ایک مخصوص خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی جسے انگریزی میں کہتے ہیں It falls between two stools نہ تو یہ خالص مرثیہ ہوتا ہے اور نہ خالص رزمیہ۔ یہ نہیں کہ رزمیہ میں مرثیہ کی جگہ نہیں اور میں نے فردوسی کے شاہنامہ کا حوالہ بھی دیا تھا اور کچھ اقتباسات بھی پیش کئے تھے، لیکن صنفی طور پر مرثیہ اوّل و آخر مرثیہ ہے، اس کو زبردستی رزمیہ کا رنگ دیا گیا ہے اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نہ تو دبیر اور نہ انیس میں یہ تعمیری صلاحیت تھی کہ وہ واقعۂ کربلا کو ایک مکمل نظم کی صورت میں پیش کریں۔ شاید وہ کوشش کرتے بھی تو کامیاب نہ ہوتے۔ کیونکہ وہ epic کی architectonics سے واقف نہ تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے پروفیسر شبیہ الحسن صاحب سے دریافت کیا تھا کہ کسی نے یہ کوشش کی ہے کہ انیس کے ہم بحر مرثیوں کو ترتیب دے کر واقعۂ کربلا کا پورا نقشہ دکھلانے کی کوشش کریں۔ ان کا جواب نفی میں تھا۔ عرصہ ہوا میں نے انیس کے مرثیوں کو لے کر ہم بحر مرثیوں کو tick off کر دیا تھا۔ ارادہ تھا اس طرح

ایک یا دو رزمیے کی ترتیب دی جائے لیکن میں اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کو مکمل نہ کر سکا اور اب وہ مرثیے جن پر میں نے نشان لگا دیئے تھے میرے پاس نہیں ہے۔ بہر کیف جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اُردو شاعری کے ان حصوں کے خلاف زیادہ شدید ردِ عمل نہیں ہوا۔ البتہ یہ شکایت ضرور ہوئی کہ میں نے کسی صنف کو نہیں بخشا۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ سبھی پر نکتہ چینی کی اور قصیدہ، مثنوی، مرثیہ لکھنے والوں پر بھی لیکن ان شکایتوں میں شدت نہ تھی، برہمی خفگی نہ تھی اور کسی نے میرے اعتراضات کا جواب بھی نہ دیا۔

"اُردو شاعری" کا دوسرا حصہ بھی برہمی کا سبب ہوا۔ جہاں اکبر، حالی، اقبال، جوشؔ، ترقی پسند شعراء زیرِ بحث تھے اور ان کے ساتھ بھی میرا وہی رویہ تھا جو غزل گو شعراء کے ساتھ تھا۔ مسدسِ حالیؔ مقبول نظم تھی لیکن میں نے کہا کہ اس نظم میں شعریت نہیں اور اچھی نثر بھی نہیں اور کوئی سمجھ بوجھ بھی نہیں، اس سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ فراقؔ نے بھی لکھا کیا آپ اس کی ظاہری سادگی اور بے رنگی کا دھوکہ کھا گئے۔ لیکن سادگی اور چیز ہے اور نثریت کچھ اور۔ فراقؔ نے یا کسی اور شخص نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی نہ کی کہ جو مثالیں میں نے دی تھیں ان میں نثریت نہیں تھی۔ اس طرح میں نے کہا تھا کہ اس مسدس میں ربط و تسلسل مکمل نہیں اور ارتقائے خیال بھی فطری نہیں ارادی ہے۔ مضامین پھول کی طرح نہیں کھلتے بلکہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر اس کی عمارت بنائی گئی ہے۔ اینٹیں ایک دوسرے سے پیوستہ نہیں، دیواریں ہیں تو کج اور بے ڈھنگی، مینار و سقف میں بھی تناسب نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے محدود ٹکڑوں میں بھی، دو مصرعوں، دو بیتوں، دو بندوں میں بھی وہ ربط و تسلسل نہیں جو ہونا چاہیئے اور میں نے اپنی بات کے ثبوت میں چار بند پیش کئے تھے اور دکھایا تھا کہ ان چار بندوں اور ان کے مصرعوں کی ترتیب میں رد و بدل ممکن ہے، جو مثال میں نے دی تھی اسے آج بھی اُردو شاعری میں آپ پڑھ سکتے ہیں اور فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صحیح ہے یا غلط۔ غالباً کسی کو اس سے اختلاف نہ ہوگا کہ میری باتیں مفصل ہوتی ہیں اور مثالوں یا ثبوت سے بھرپور۔ مجھے اپنے معترضین سے گلہ یہی ہے کہ وہ پوری باتیں پڑھتے نہیں اور پڑھ کر Pointwise ان کا جواب نہیں دیتے۔ بلکہ عام قسم کے اعتراضات کرتے ہیں جن کا میری تنقید سے بہت کم واسطہ ہوتا ہے۔

بخلاف حالی، اکبر کے ساتھ میں نے بقول معترضین ضرورت سے زیادہ ہمدردانہ سلوک کیا، اکبر کو نئی روشنی والے قدامت پرست، رجعت پسند، تصور پرست اور نہ جانے اور کیا کیا کہا کرتے تھے۔ میں نے اکبر کی

شاعری کی خوبیوں پر تفصیل سے لکھا، قدامت پرستی، رجعت پسندی کو غیر متعلق قرار دیا اور جتنی تعمیری تنقید، ان کے شعروں سے متعلق میں نے کی وہ پہلے شاید کسی نے نہیں کی تھی۔ لیکن اکبر کا آرٹ مختصر تصویریں یا نقشے بنانے کا ہے اور یہ تصویریں حسین بھی ہیں اور موثر بھی اور اپنے مقصد میں کامیاب۔ اسی لئے مجھے کہنا پڑا کہ اگر وہ نظم کے صحیح مفہوم سے واقف ہوتے اور اس بات میں مغرب سے کچھ سیکھتے، تو ان کی شاعری کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی، تو پھر اردو کے شیدائی چلّا اُٹھے کہ میں نے نظم اور مغرب کا نام کیوں لیا۔ گویا مجھ سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ حالانکہ جو میں نے کہا ہے، وہ بدیہی بات ہے۔ اگر اکبر نظمیں لکھتے اور اپنا وقت مفرد اشعار اور دو شعروں کے قطعوں پر برباد نہ کرتے، تو ان کے فن میں عظمت آجاتی جو ان میں نہیں ہے اور کامیاب نظمیں لکھنے کے لئے مغرب سے استفادہ ضروری تھا۔

سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ میں نے اقبال کو بھی نہ چھوڑا۔ یہاں چھوڑنا نہ چھوڑنا غیر متعلق سی بات ہے۔ میری thesis یہ ہے: (۱) قومی و ملّی شاعری سریع التاثیر ہوتی ہے۔ چند جذبات کو زور شور سے اُبھارتی ہے لیکن اس کی دنیا بہت تنگ ہے۔ (۲) پیغام محض شعر نہیں ہو سکتا۔ پیغام اور شعر میں کوئی بیر نہیں شرط یہ ہے کہ پیغام شعری تجربہ بن جائے لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو ان دونوں باتوں سے انکار ہے، تو پھر آپ کے اور میرے درمیان کوئی common ground نہیں۔ بہرکیف میں نے انہیں دو اصول کی روشنی میں اقبال کی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ 'خضر راہ' اور 'طلوع اسلام' کا تجزیہ کر کے demonstrate کیا ہے کہ خیالات محض اور شعری تجربے میں کیا فرق ہے۔ جہاں خضر راہ کے پہلے بند میں شعریت ہے جیسے جیسے خیالات آگے بڑھتے ہیں ان کے جوش اور ولولہ انگیزی میں ترقی ہوتی ہے لیکن شعریت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ میں نے حسب معمول مثالیں دی ہیں:

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر	تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیرخوار	موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر	انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

اور یہ نثر ہے:

ربط و ضبط ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات	ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو	ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ۔۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اسی طرح "طلوعِ اسلام" میں یہ شعر ہے :

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا ۔۔۔ بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اور یہ نثر ہے :

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے ۔۔۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح کی بہت سی مثالیں میں نے دی ہیں اور شعر اور نثر کا فرق واضح کیا ہے۔ مجھے گلا یہی ہے کہ کوئی ان باتوں کا جواب نہیں دیتا، صرف برہم ہوتا ہے کہ میں نے اقبال کی خامیوں کو واضح کرنے کی جرائت کیسے کی۔ اور کوئی اس بات کا اقرار بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ میں نے سب سے پہلے اقبال کی نظم "شعاعِ امید" کے شعری حسن پر روشنی ڈالی اور یہ بھی کوئی نہیں کہتا کہ "شاہین"، "لالۂ صحرائی" اور خصوصاً "ساقی نامہ" کی شعری اہمیت میں نے بتائی اور یہ بھی بتایا کہ ان نظموں میں خیالات دوسری نظموں سے مختلف نہیں۔ لیکن یہاں وہ خیالات، وہ پیغام، شعری تجربے بن گئے ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ میں نے اقبال کی غزلوں کی طرف بھی توجہ دلائی اور کہا کہ انہوں نے خیالات کی دنیا بدل دی اور یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی شخصیت کی بزرگی کا ثبوت ہے لیکن ان باتوں کو اَن سُنی کر دیتے ہیں۔

میں نے اقبال کے ساتھ وہی سلوک کیا، جو ایک دیانت دار نقاد کو کرنا چاہیئے۔ یعنی ان کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی اور ان کی شاعری کی حدود کو بھی واضح کیا۔ اب اسے کیا کیجئے کہ تنقید ایک روشن لیمپ ہے جس کی تیز روشنی میں کسی کی شاعری اپنے اصلی خد و خال میں نظر آنے لگتی ہے۔ ان مصنوعی خد و خال میں نہیں جو ہماری جذبات پرستی نے بنا رکھے ہیں۔ اقبال بالقوہ بڑے شاعر تھے۔ لیکن بالفعل بڑے شاعر نہیں تھے لیکن جہاں تنقید کا مفہوم صرف تحسین ہو، مبالغہ آمیز تحسین ہو، وہاں صحیح تنقید سے چراغ پا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جوش پر بھی میں نے تفصیل سے لکھا اور جس وقت لکھا اس وقت جوش کا بول بالا تھا۔ اس لئے اس کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جوش کی شاعری ہنگامی شاعری ہے، جو نری لفاظی بھی ہے اور میں نے انہیں کے شعروں کو ان پر بہترین تنقید بنائی تھی، ان میں سے چار اشعار سن لیجئے :

میری کاخِ شاعری کی نو بھی سنگِ فتور ۔۔۔ ایک طفلانہ بلوغ اک کھوکھلا سنِ شعور

میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام — ایک درد انگیز درماں اک شکستہ آمادہ جام
وصل کے دوچار نغمے ہجر کی ایک آدھ آہ — نعرے ناواقفیت، سطح دریا پہ نگاہ
گاہ مرنے کے عزائم گاہ جینے کی اُمنگ — بس یہی سطحی سی باتیں بس یہی اوچھے سے رنگ

میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ جوش کی بہت ساری نظموں کا فارم اقبال کی فارسی نظموں سے ماخوذ ہے اور یہ بھی بتایا تھا کہ جو سلیقہ، جو سمجھ بوجھ، جو شعری حُسن اقبال کی بعض نظموں میں ہے، وہ جوش کی نظموں میں نہیں اور پھر جوش کی ایک نظم جس کا پہلا شعر ہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

کا تنقیدی تجزیہ کر کے تعریف (علی سردار جعفری اور عزیز احمد کی تعریف) اور تنقید کا فرق بتایا تھا اور جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کا آج تک کسی نے تفصیلی جواب نہیں دیا۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی نہ کی کہ جو باتیں میں نے کہی تھیں وہ صحت سے دور تھیں اور پھر میں نے حرفِ آخر کے ایک حصے کا تفصیلی تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ جوش کے مانگے ہوئے افکار تخئیلی تجربہ نہیں بن پاتے۔ بات یہ ہے کہ لفاظی شاعری نہیں۔ جوش کے پاس الفاظ کا کھوکھلا ڈھول تھا، جسے انہوں نے زور شور سے بجایا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا ان کا کھوکھلاپن نظر آنے لگا اور جو کچھ میں نے کہا تھا اور جس نتیجہ پر میں پہنچا تھا آج اسے سبھوں نے مان لیا۔ آج شاید جوش کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔

اور جب ترقی پسند شاعری کا عروج تھا، اس وقت میں نے ان کی ہنگامہ آرائی کے خلاف آواز بلند کی اور یہ بتایا کہ اقبال نے جس پردہ منہ آتے تھے۔ ترقی پسندوں سے پہلے ترقی پسندانہ باتیں کہی تھیں۔ لیکن زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ زیادہ شاعرانہ ڈھنگ سے اور بہت سی باتیں جنہیں ترقی پسند شعراء اپنی نظموں میں دُہراتے تھے وہ اقبال کی نظموں کی صدائے بازگشت تھی اور میں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں بقول ایلیٹ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جو ہمارے سامنے ہے وہ شعر ہے یا کچھ اور۔ اور میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ترقی پسند نظموں میں نعرہ بازی ہے، پروپگنڈا ہے، فلسفہ ہے، اشتراکیت ہے، سرمایہ داری کے خلاف بغاوت ہے اور بہت کچھ ہے، لیکن شاعری نہیں ہے۔ اور پھر بعض شاعروں پر تفصیل سے لکھا تھا خصوصاً علی سردار جعفری پر اور جہاں ان کی پروپگنڈا بازی کی مذمت کی تھی وہاں ان کی

اچھی نظموں کی نشاندہی بھی کی تھی اور خصوصاً ان کی دو نظموں سے متعلق لکھا تھا کہ اگر ان میں سے بیکار مصرع یا بند نکال دیے جائیں تو وہ بہت اچھی نظمیں ثابت ہوں گی اور وہ نظمیں تھیں "میرے خواب" اور "پتھر کی دیوار" شاید اس سے زیادہ تعمیری تنقید ممکن بھی نہ تھی اور پھر میں نے فیض کو دوسرے ترقی پسند شعراء کے مقابلے میں امتیازی حیثیت دی تھی کیونکہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس تھا اور وہ ان تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے تھے اور دوسری خصوصیت یہ بھی تھی کہ فیض میں ایک خود ضبطی تھی وہ اپنے کو لئے دیے رہتے تھے اور سر پھرے باغیوں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلا دیتے تھے اور میں نے بتایا تھا کہ حسن اور انقلاب میں کوئی تضاد نہیں، دائمی مخاصمت اور تصادم نہیں۔ اگر انقلاب حسن بن جائے، تو شاعری کی جوئے کم آب میں پانی کی فراوانی ہو سکتی ہے۔

ایک باب آزاد نظم سے متعلق ہے۔ اس میں میں نے مغرب شاعری کے نقالوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے آزاد نظم سے کم آزاد کوئی نظم نہیں No vers is libre for the man who wants to do a good job لیکن آسانی کی خوگر طبیعت کو نظم سے زیادہ غزل دل آویز ہے اور پابند نظم سے زیادہ آزاد نظم عزیز۔ کیونکہ یہاں ہاتھ باگ پر نہیں ہوتا اور نہ پاؤں رکاب میں، رخش قلم رو میں رہتا ہے۔ جب تھک جاتا ہے تو رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے آج کہ آزاد نظم، نظم معرّا، نثری نظم، شعری نثر وغیرہ کا ناموزوں سیلاب ہے:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

بہرکیف یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اگر میں مغرب زدہ ہوتا، تو میں آزاد نظم کا پرستار ہوتا اور آزاد نظم لکھنے والوں کی مداحی کرتا۔ لیکن صورت حال کچھ اور ہے۔ وہ فارسی کی پیروی ہو یا انگریزی کی اگر کامیاب ہے، تو قابل ستائش ہے ورنہ نہیں۔

آخر میں میں نے غزلوں پر نظر ڈالی تھی اور پانچ غزل گو شعراء کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ جگر، اصغر، فانی، حسرت اور فراق۔ حسرت اور فراق کی خوبیوں کو سراہا تھا، اصغر اور فانی کو بھی ان کے حدود کے اندر سراہا تھا۔ لیکن جگر پر نکتہ چینی کی تھی اس لئے میں معتوب ٹھہرا کہ میں نے جگر کی تعریف کیوں نہ کی اور یہ بات بالکل نظر انداز کر دی گئی کہ میں نے حسرت اور فراق، اصغر اور فانی کے محاسن کا تنقید کی زبان میں بیان کیا تھا، لیکن اندھا دھند تعریف نہیں کی تھی۔ ان کی بھی حدود کو، ان کی بھی خامیوں

کی نشاندہی کی تھی اور اقبال کی غزلوں کے بارے میں لکھا کہ نئی آواز ہے، نئی زبان ہے، نئی باتیں ہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ جس زمانے میں اقبال نے اس انداز میں غزلیں کہیں وہ بہت بڑا کارنامہ تھا، اسی طرح میں نے بتایا کہ جوہر کی غزلوں میں بھی نئی آواز اور نئی باتیں ہیں اور اگرچہ ان کی غزلیں کوئی بڑا کارنامہ نہیں پھر بھی ان میں خلوص کی آواز ہے جو اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔

میں پھر یہی کہوں گا کہ کسی نے اردو شاعری کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ کتاب منتشر خیالات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مربوط، منظم اور مسلسل تنقید ہے۔ اسی لئے شاید نیاز فتحپوری نے لکھا تھا کہ یہ اردو شاعری پر پہلی کتاب ہے جس کا ایک ورق بھی بیکار نہیں لیکن قارئین کا ذہن چونکہ غزل کا تربیت یافتہ ہے اس لئے وہ ادھر ادھر سے چند جملے چن کر ان پر اپنی برہمی کا اظہار کرتا ہے اور محض تخریبی تنقید ہے۔ سراسر تنقیص ہے، مغرب زدگی کا نتیجہ ہے اور اسی قسم کے جملے کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ اسے غور سے پڑھے یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں غیر ذمہ دارانہ، نادری احکام نہیں ہیں منطقی باتیں ہیں، منطقی دلائل ہیں، منطق اور سائنسی زبان ہے ان کا جواب جذباتی ردعمل نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

اصل دشواری یہ ہے کہ اُردو میں تنقید سے مراد تعریف ہے، تحسین ہے، تقریظ ہے اور کبھی کبھار نری تنقیص، بیجا نکتہ چینی، بے حاصل خردہ گیری ہے آج بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تنقید ایک قسم کی پرکھ ہے۔ ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا ممکن ہے۔ یہ تنقید نہیں کہ ہم کسی شاعر کی وہ میر ہوں، غالب ہوں، انیس ہوں، اقبال ہوں یا کوئی اور مبالغہ آمیز، صحت سے دور تعریف کریں اور اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ تنقید یہ ہے کہ ہم ان شاعروں یا کسی اور شاعر کی خوبیوں، خامیوں اور حدود سبھی کو واضح طور پر بے کم و کاست بیان کریں۔ اگر ہم ان کی صرف خامیاں بیان کریں تو یہ تنقیدی بد دیانتی ہو گی۔ اسی طرح اگر ہم ان کی خوبیوں کو اُچھالیں اور ان کی خامیوں سے چشم پوشی کریں، تو یہ بھی تنقیدی بددیانتی ہو گی، لیکن اُردو میں اسی بد دیانتی یعنی خوبیوں کو اُچھالنا اور خامیوں پر پردہ ڈالنا۔ اسی بد دیانتی کو اصل تنقید سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اُردو میں خطائے بزرگان گرفتن خطاست پر عمل کیا جاتا رہا اور شعراء کا شمار بزرگوں میں ہے، اس لئے ان کی خطاؤں کی پردہ داری اصل ایمان ہے لیکن خطا بزرگوں سے سرزد ہو تو

بھی خطا ہے اور خردوں سے سرزد ہو تو بھی خطا ہے۔ از روئے اخلاق خطا پوشی اچھی بات ہو اور خطا بینی بُری
لیکن تنقید میں خطا پوشی اصل ایمان نہیں بلکہ ایک قسم کا گناہ ہے اور خطا بینی کی ضرورت آپڑتی ہے البتہ
اگر اچھائی سے چشم پوشی کی جائے یا اچھائی کو بُرائی بنا کر پیش کیا جائے تو وہ گناہ ہے۔ کہہ سکتے ہیں
کہ مشرقی اُفتادِ طبیعت بُت گری اور بُت پرستی کی طرف مائل ہے تو بات یہ ہے کہ اسی افتادِ طبیعت کی
وجہ سے ہم اپنے شعراء کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم اسے مانیں یا نہ مانیں۔ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ وغیرہ
ہمارے لئے دیوتاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ کوئی اپنے دیوتاؤں کی نکتہ چینی برداشت
نہیں کر سکتا اور برداشت کرے تو کیسے۔ اس کے پرستارانہ جذبات کو زبردست ٹھیس لگتی ہے اور
یہ دیکھ کر اور سُن کر اس کی مقدس ہستیوں کو ہدفِ ملامت بنایا جارہا ہے، اس کی رگِ حمیت جوش میں آتی
ہے اور وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ ناگزیر ہے کیونکہ اگر وہ ایسا
نہ کرے تو پھر اس کے ایمان میں خلل پڑ جائے گا۔ اس کی ساری ذہنی اور جذباتی دنیا متزلزل ہو جائے گی
یہی وجہ ہے کہ وہ کھلے ذہن سے نہ کسی بات کو سُن سکتا ہے اور نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے
بلکہ اس کا اور اس کی گردہ کا ایک ہی ردِ عمل ہے۔ جیسا کہ گالزوردی نے کہا ہے: 'heads
down, horns pointed' مخالف کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب ان پجاریوں کو یہ کون
بتائے کہ شاعر دیوتا نہیں وہ ہم آپ جیسا انسان بھی ہے اور کوئی شاعر وہ شیکسپیر ہی کیوں نہ ہو برابر اچھی
نظمیں نہیں لکھ سکتا اس لئے اس کی کچھ نظمیں اچھی ہوتی ہیں تو کچھ بُری بھی ہوتی ہیں اور یہ تنقید کا فرض ہے کہ
وہ اچھے بُرے میں امتیاز کرے، ان کے فرق کو واضح کرے، اس کے لئے منطقی دلیلیں پیش کرے تو اگر آپ اسی
بات کو مان لیں کہ شاعر دیوتا نہیں، شاعر ہے اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ
اس بات کو مان لیں تو میری باتیں طبعِ نازک پر گراں نہ گزریں گی کیونکہ میرا شیوہ بُت گری یا بُت پرستی نہیں
اور میں قصداً بُت شکنی بھی نہیں کرتا۔ میں شاعر کو شاعر سمجھتا ہوں اس کی نظموں کو پوری توجہ سے پڑھتا ہوں
اس کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور انہیں بیان بھی کرتا ہوں۔ البتہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا
بلکہ اگر اسی کی نظموں میں کچھ خامیاں ہیں، اگر شاعری کی کچھ حدود ہیں تو انہیں بھی بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں
اب اسے آپ بُت شکنی کہیئے تو کہیئے میں اسے حق بینی کہتا ہوں۔

جہاں میری تنقید سے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، وہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ میری تنقید

تخریبی ہے تو اگر تنقید کا مفہوم آپ کے خیال میں نری مدّاحی ہے تو البتّہ میری تنقید تخریبی ہے لیکن بات یہ ہے کہ اچھی تنقید تخریبی نہیں ہوتی یہ ہمیشہ تعمیری ہوتی ہے وہ کسی صنف سے متعلق ہو یا کسی شاعر سے میں نے ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو چیز پیش نظر ہے وہ کیا ہے، اس کی حدود و امکانات کیا ہیں یا اس میں کیا کمی ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ مثلاً غزل کو لیجئے میں نے بتایا اور یہ کوئی نئی بات نہیں کہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اشعار ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا کہ اس کے اشعار میں ربط و تسلسل نہیں، ارتقائے خیال نہیں، ابتدا وسط اور انتہا میں کوئی ربط نہیں اور پھر میں نے کہا کہ ربط و تسلسل ہونا چاہیئے، ارتقائے خیال ہونا چاہیئے، ابتدا، وسط اور انتہا میں ربط کامل ہونا چاہیئے، اور یہ بھی بتایا کہ یہ سب چیزیں غزل کے فارم کو قائم رکھتے ہوئے بھی حاصل ہو سکتی ہیں اسی لئے میں نے مسلسل غزلوں قطعہ بند غزلوں کی مثالیں پیش کیں اور نظیر کی ایک نظم کو توڑ مروڑ کر اسے نظم کی صورت میں پیش کیا۔ اسی طرح میں نے قصیدہ سے متعلق کہا کہ اس کے چار حصّے ہیں تشبیب، گریز، مدح، دعا۔ اہم حصّہ مدح کا ہے جس میں ناموزوں، مبالغہ آمیز مداحی ہوتی ہے، جو مذاق سلیم پر گراں گزرتی ہے اور پھر یہ بھی بتایا کہ قصیدہ سے ode کا کام لیا جاسکتا تھا خصوصاً اس کا پہلا حصّہ جسے تشبیب کہتے ہیں اس میں کافی گنجائش ہے اور کبھی کبھار اس گنجائش سے اچھا کام بھی لیا گیا ہے لیکن اسے قصیدہ کے اور اجزا سے الگ کر کے مختلف و متنوع مضامین پر نظمیں لکھی جاسکتی ہیں۔

یہ رہی صنف کی مثالیں۔ اسی طرح میں نے میرؔ سے متعلق لکھا کہ ان کی قوت حاسّہ بہت تیز تھی اور ان کی تلخ و غم انگیز جذبات اور احساس تھے۔ لیکن غزل کی ریزہ کاری کی وجہ سے ان کے شدید جذبات اور احساس کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا اگر وہ انہیں کو مرتب و منظم صورت میں پیش کرتے تو وہ دنیا کے ایک بہترین شاعر یاس ہوتے۔ یا میں نے غالبؔ سے متعلق لکھا ہے: "شاعر اپنے زمانے میں ادراک کے سب سے اونچے مقام پر ہوتا ہے۔۔۔ غالب اپنے زمانے میں ادراک کے اسی بلند مقام پر تھے اور اس جگہ سے زندگی ماحول، پیش نظر اور آئے دن ہونے والی چیزوں کو دیکھتے تھے۔ لیکن اپنے تاثرات کے لئے انہیں ایک سانچہ ملا یعنی غزل اور وہ بھی ناقص اس لئے وہ اتنے بلند و بزرگ کارنامے نہ پیش کر سکے، جو ان کی شان کے شایان تھے" کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نری تخریبی تنقید ہے۔ یہاں رچرڈز کے الفاظ میں میں نے غالب کو وہی

مقام دیا ہے جو ایک بڑے شاعر کا ہوتا ہے۔ یہ ان کے ساتھ انصاف ہے نا انصافی نہیں۔ لیکن اسے کیا کیجیۓ کہ زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر غالب نے بھی غزل کو اپنے تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اس لئے نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی وہ اتنے بلند و بزرگ کارنامے نہ پیش کر سکے جو ان کے شان کے شایان تھے۔ مغربی نظم نہ سہی، اگر وہ نظیر کی طرح مخمس، مسدس، مثلث وغیرہ میں اپنے تجربوں کو پیش کرتے تو ان کے کارنامے زیادہ وقیع، زیادہ رفیع، زیادہ وسیع ہوتے لیکن انہوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور تنگنائے غزل ہی سے دل بہلاتے رہے۔ یہ چند مثالیں سرسری طور پر پیش کی گئی ہیں ورنہ ہر جگہ میں نے یہی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کیا ہے، کیا کمی ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔

اس کے علاوہ اگر آپ اردو شاعری کو پڑھیے، جھنجھلائیے نہیں تو آپ کو ان گنت تعمیری باتیں ملیں گی۔ جن کا میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو احساس ضرور ہے لیکن آپ میرے چند جملوں سے اس قدر برافروختہ ہو جاتے ہیں کہ اور باتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں، آیئے دیکھیے:

میں نے شاعری کی اہمیت پر زور دیا اور اسے وہ مقام دیا جو شاید اسے اردو میں حاصل نہ تھا۔ پھر شاعری کی جامع تعریف پیش کی اور شاعر کی بھی۔ پھر تخیل کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور قوت حاسہ کی اہمیت پر بھی جو اردو تنقید کے لئے نئی چیز تھی اور پھر یہ بتایا کہ نظم کیا ہے۔ اردو میں نظم کے لفظ سے یا تو:

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی

یا قصیدہ، مثنوی، مسدس وغیرہ کی شکل نظر کے سامنے آجاتی تھی اور آزاد اور حالی نے مغرب کے زیر اثر نظمیں لکھیں اور نظم لکھنے کی ترغیب دی لیکن ان کے ذہن میں نظم کا صاف و صحیح conception نہیں تھا۔ میں نے پہلی بار واضح طور پر بتایا کہ نظم کیا ہے اور یہ conception عام ہو گیا ہے، مجھے یاد آتا ہے کچھ عرصہ ہوا میں نے سوغات کے ایک خاص نمبر میں دیکھا کہ سرور صاحب اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے نظم سے متعلق وہی باتیں لکھی تھیں جو میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھی تھیں۔

میں نے قطعوں کی اہمیت پر زور دیا اور رباب دوم کا ایک حصہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل   زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

کا تفصیلی تجزیہ کیا، جو مجھ سے پیشتر کسی نے نہیں کیا تھا اور بہت سارے قطعے پیش کئے اور ان کے ساتھ کچھ مسلسل یا قطعہ بند غزلوں کے بھی نمونے پیش کئے۔ میر کو بالقوہ بہترین شاعر یاس کہا اور درد، مومن، غالب کی ستائش کی۔ غالب کے قصیدہ جس کا مطلع ہے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدہ کے حسن کا پہلی بار تفصیلی جلوہ دکھایا۔ ہجو کو جسے گالی کا مرادف سمجھا جاتا تھا۔ اس کا جائز ادبی مقام دیا اور اپنے ایک دوسرے مضمون اُردو ادب میں طنز و ظرافت میں ہجو، طنز اور ظرافت کی تعریف و تشریح کی انہیں ترتیب وار irony' satire اور humour کا مرادف بتایا اور ذہنی پراگندگی و انتشار کے عوض سمجھ کی روشنی دکھائی۔ میر کی مثنوی معاملات عشق کی اہمیت بتائی اور مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں کی خوبیوں کی نشاندہی کی اور یہ افسوس ظاہر کیا کہ شوق کی ادبی جدت کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے اور نظیر کی طرف قارئین کی خصوصی توجہ منعطف کی، اس لئے نہیں کہ وہ عوامی شاعر تھا، بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ایک طرف تو مسلسل اور قطعہ بند غزلیں لکھیں اور دوسری طرف انہوں نے نظموں کی راہ لی اور ربط و تسلسل کی طرف خاص دھیان دیا۔ اسی طرح اکبر کو ان کا جائز مقام دیا اور شوق کی دو نظموں 'عالم خیال' اور 'نیرنگ خیال' پر تفصیلی تجزیاتی تنقید لکھی اور بتایا کہ شوق نے ایک قسم کا اجتہاد کیا ہے جس کی مثال اُردو میں کم ملتی ہے۔ پُرانی لکیر کو چھوڑ کر انہوں نے نیا راستہ نکالا تھا۔ یہی ان کی جدت تھی اور اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اقبال کے 'ساقی نامہ' پر خصوصاً تفصیلی تنقید لکھی اور اس کے محاسن پر روشنی ڈالی اور پھر اقبال کی غزلوں کو بڑا کارنامہ کہا۔ جوہر کے خلوص کی نشاندہی کی اور حسرت اور فراق کو غزل گو شاعروں کی فہرست میں ان کا جائز مقام دیا۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ کیا یہ سب تجزیبی تنقید تھی اور ان کے علاوہ اس بسیط پیمانہ پر تجزیاتی اور تقابلی تنقید کا نمونہ پیش کیا، جو پیشتر کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مقصد نہ تو اعتذار ہے اور نہ تعلی فقط حقیقت کا اظہار ہے۔

اب میں ایک بات اور کہہ دوں جس سے نہ صرف اردو شاعری کو سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی۔ بلکہ میرا تنقیدی نقطۂ نظر بھی واضح ہو جائے گا۔ یہ بات میں نے اپنے ایک حالیہ لکچر 'اصول تنقید' میں

کہی تھی اور وہ یہ ہے : " نقاد کو اپنے دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا چاہیئے، تاکہ اس میں نئے، تازہ، زندہ، زندگی بخش اور اَن جانے خیالات بے تکلف سما سکیں۔ وہ خیالات جو دوسرے ادبوں اور کلچروں میں رواں دواں ہیں ہمیں بقول آرنلڈ اپنے خیالات کے ذخیرے میں صحت مند اور تازہ خیالات کا اضافہ کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی فیصلہ درخور اعتنا ہے جو صاف، غیر جانبدار اور پُراز معلومات دماغ کرتا ہے۔ نقاد کو ہمیشہ علم اور تازہ علم کی پیاس چاہیئے۔ کیونکہ دنیا کے بہترین خیالات و تصورات و معلومات سے واقفیت ہی اسے آزادئ خیال عطا کر سکتی ہے اور آرنلڈ کے خیالات کو توسیع دے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہی تنقید مفید اور اہم ہے، جو دنیا کو رُوحانی اور دماغی مقاصد کے لئے ایک واحد مملکت سمجھتی ہے اور خصوصی اور مقامی اور عارضی رشتوں سے آزادی اختیار کر لیتی ہے۔ دنیائے ادب، دنیائے خیالات ایک ہے۔ اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا، مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کرنا خودکشی کرنا ہے۔ اس مصنوعی تقسیم کا نتیجہ ہے کہ ہمارے فیصلے جزئی ہوتے ہیں، ہمارے خیالات کی دنیا تنگ ہو جاتی ہے اور ہم ایک قسم کی جارحانہ دماغی اور روحانی نخوت کا شکار ہو جاتے ہیں جو غول بیابانی کی طرح ہماری تباہی کا سبب ہوتی ہے۔ کوئی شاعر، کوئی فن کار اپنا علاحدہ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی صحیح قدر و قیمت ہمیں اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم اسے دوسرے شعراء اور فن کاروں کی صف میں لا کھڑا کریں۔"

---

(۲)

آپ نے دیکھا کہ میرے ایک جملہ کا کیا شدید ردعمل ہوا - غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے ، یہ جملہ آج سے اڑتیس (۳۸) سال پہلے لکھا گیا تھا ، لیکن لوگ آج تک اسے نہیں بھولے ہیں اور شاید جب تک اُردو میں غزل لکھی جاتی رہے گی اس وقت تک یہ جملہ دلوں میں کھٹکتا رہے گا - یہی اثر ایک دوسرے جملے کا بھی ہوا ، وہ جملہ جس سے "اُردو تنقید" کی ابتدا ہوتی ہے : "اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے - یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے ، یا معشوق کی موہوم کمر ، کسی نے کہا اس میں لطفِ زبان تو ہے ، لیکن صحت نہیں - کسی نے کہا یہ مبالغہ ہے - کسی نے کہا یہ سنسنی خیزی ہے اور کچھ نہیں - لیکن اسے کیا کیجئے کہ میں تنقید میں لطفِ زبان سے دور بھاگتا ہوں ، مبالغہ سے پرہیز کرتا ہوں اور سنسنی خیزی میری سرشت میں نہیں - میں نے جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر لکھا ہے ، اس کے Im-plictions کو جانچ پرکھ کے بعد لکھا ہے - لوگ کہتے ہیں کہ اگر اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے تو اس موہوم شئے کو موہوم ثابت کرنے کے لئے میں نے تقریباً چار سو صفحے برباد کیوں کئے - لیکن ذرا سوچئے تو نئے اور پرانے تذکرے کتنے ہیں - برائے نام تنقیدیں کتنی ہیں - اگر آپ اس میز پر تذکروں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے جائیں پھر آبِ حیات ، گلِ رعنا ، شعر الہند ، اور پھر شبلی وحالی اور حالی کے پیرووں کی تصنیفوں سے علی سردار جعفری کی ترقی پسند ادب تک تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتابیں اس میز سے اٹھتے اٹھتے چھت کو چھو لیں گی یعنی سوچئے تو جہاں ہزار ہا صفحے تنقید کے نام پر سیاہ کر دیئے گئے ہیں اگر میں ۴۰۰ صفحوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں کہ یہ تنقیدیں نہیں کچھ اور چیزیں ہیں ، تاریخیں ہیں ، تقریظیں ہیں ، تنقیصیں ہیں ، رائیں ہیں ، پُرلطف یا بے مزہ باتیں تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے اور میں نے اُردو تنقید کے دوسرے اڈیشن میں یہ بات واضح کر دی تھی - دیکھئے :

اصول تنقید سے عدم واقفیت میں - - - جو بات بھی کہی جائے گی وہ تنقید نہ ہوگی رائے زنی ہوگی - ممکن ہے کہ بعض رائے صحیح ہو ، لیکن یہ اتفاقی بات ہوگی -

اگر آپ کشت کاری کے اصول سے واقف نہیں، تو آپ کسان نہیں بن سکتے۔ اسی طرح اگر آپ اصولِ تنقید سے واقف نہیں تو آپ نقاد نہیں بن سکتے۔ اُردو میں اصولِ تنقید کی ترتیب و تشریح ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ تذکروں میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے: (۱) شعراء کا ذکر باعتبار حروف، تہجی ہے اس لئے پراگندگی لازمی نتیجہ ہے (۲) شعرا کی زندگی ناکافی ہے، اس میں بے جا اختصار ہے، کبھی کبھار شاعر کا صرف تخلص ہوتا ہے۔ (۳) شعراء کی شخصیت کی تعمیر بھی ناکامیاب اور ناکافی ہے۔ (۴) تنقیدی حصہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہت سے شعراء ایسے ہیں جن کے کلام پر رائے زنی نہیں ہوتی۔ ان اجزاء کے علاوہ ادبی، سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی نکتے بھی ملتے ہیں اور شعراء سے متعلق کچھ دلچسپ واقعات بھی جن کی اہمیت ان ادبی، سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی نکتوں سے زیادہ ہے۔ تذکروں کا ایسا تفصیلی تجزیہ پہلے کسی نے نہیں کیا تھا اور کوئی یہ بھی نہیں کہتا کہ جو اجزاء میں نے بتائے ہیں ان سے زیادہ یا کم اجزا تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی گلہ ہے کہ میں نے تذکروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میں نے خاتمہ میں لکھا ہے:

"تذکرہ نویس تنقید، ادب، شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ وہ شاعر ہوتے تھے لیکن کبھی اپنے فن اور فن کے پیچیدہ مسائل پر غور و فکر نہیں کرتے تھے اور کبھی کبھار غور و فکر کرتے بھی تھے، تو غور و فکر کا کوئی روشن نتیجہ نہ ہوتا تھا اور ان کے پیش نظر چند اصول تو تھے لیکن یہ اصول بہت محدود تھے۔ زبان اور عروض سے متعلق تھے۔ شاعری سے نہیں۔ شعر کی تعریف، زبان کی صفائی، محاوروں کی چستی، بندشوں کی درستی سے متعلق ہوتی تھی۔ صنائع اور بدائع اچھے سمجھے جاتے تھے۔"

اسی صورت حال کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ "تذکرے بیاضیں ہیں، تنقیدیں نہیں۔ ان میں بہت کچھ خام مواد ہے۔ جس سے نقاد کام لے سکتا ہے۔ اُردو شاعروں کے ماحول، نقطۂ نظر، طرزِ معاشرت وغیرہ سے متعلق بہت کچھ لکھ سکتا ہے اس لحاظ سے یہ تذکرے مفید ہیں۔ لیکن اس افادیت کی وجہ سے انہیں تنقیدی کارنامہ سمجھنا صحت سے دور ہے۔"

یعنی تذکرے تنقید نہیں، اُردو شاعری کی تاریخ کے لئے Source Material ہیں اور یہی ان کی اہمیت ہے اور یہی میں نے کہا ہے اور جو میں نے لکھا ہے، وہی دوسرے بھی لکھتے ہیں۔ دیکھئے اردو تنقید کا پانچواں باب جس کا عنوان ہے "غلطیہائے مضامین"، اور احتشام صاحب بھی جو تذکروں سے متعلق کہتے ہیں اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے: اگر تذکروں کا تنقیدی پہلو بہت کمزور اور تشنہ ہے۔ اگر جہاں تک اصولِ تنقید کے ارتقاء

پانے کا سوال ہے ان تذکروں سے بہت زیادہ مدد نہیں ملتی، اگر تذکرہ نگاروں نے شعراء کی شاعری کو خود شعراء کے انفرادی یا اجتماعی شعور سے متعلق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ان سے فلسفۂ نقد کے اہم اصول مرتب نہیں کئے جا سکتے، اگر ان اصولوں کی مدد سے ہم شاعر کے نہاں خانۂ دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے تو؟

آبِ حیات، گلِ رعنا، شعر الہند سے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے غالباً لوگوں کو زیادہ اختلاف نہیں۔ یوں تو اختلاف ضرور ہے۔ چونکہ میری ہر بات سے اختلاف کرنا شیوۂ اہلِ نظر ہو گیا ہے۔ لیکن شاید میں نے پہلی بار بتایا کہ آبِ حیات، کی اہم خصوصیات، مثلاً عبارت آرائی، واقعہ نگاری، مبالغہ یہ چیزیں انہوں نے تذکروں سے سیکھی ہیں اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ آزاد قیاس کے گھوڑے دوڑاتے تھے لیکن میں نے جب لکھ دیا کہ آبِ حیات کا اہم ترین عیب اس کی انشا ہے، تو کوئی صاحب بپھر گئے اور دانستہ میرے جملے کا غلط مطلب لگایا کہ میں آزاد کی زبان پر اعتراض کر رہا ہوں۔ حالانکہ اگر آپ پوری عبارت پڑھیں تو میرا مطلب بالکل واضح ہے ۔۔ دیکھئے:

"ان کی عبارت آرائی دو خامیوں کا سرچشمہ ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ نقاد اپنے موضوع کو پس پشت ڈال کر الفاظ کے حسن اور عبارت کی رنگینی میں جا پھنستا ہے اور دوسری خامی یہ ہے کہ اس قسم کے اسلوب میں خیالات اور ان کے مختلف پہلوؤں کو صاف محکم اور معین طور پر بیان کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آبِ حیات میں یہ دونوں خامیاں موجود ہیں۔ انشاء کے لحاظ سے یہ بلند پایہ ہو۔ کم سے کم اس کی شہرت اور عام مقبولیت کا سبب اس کی انشا ہے لیکن اسی وجہ سے اس کی تنقیدی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔" مطلب بالکل صاف ہے کہ آزاد کی زبان تنقید کی زبان نہیں اور بس۔ بہرکیف 'گلِ رعنا' اور شعر الہند کو میں سمجھتا ہوں کہ اقرار کرے یا نہ کرے کوئی ان دونوں کتابوں کو تنقیدی کارنامہ نہیں سمجھتا۔

یہ تو پرانے تذکرے تھے اور میں نے ان میں جو تنقید ملتی ہے، اسے ایک جملے میں مکمل طور پر بیان کر دیا ہے "یہ لفظ صحیح نہیں یہ محاورہ غلط ہے۔ یہ بحر ناجائز ہے بس یہی پرانی تنقید کی بساط ہے۔" لیکن اُردو تنقید کے جس حصہ کا شدید ردِ عمل ہوا، وہ حالی سے متعلق ہے۔ وجہ وہی ہے جو میں نے پہلے لکچر میں بیان کی تھی۔ یعنی یہاں عقیدہ یہ ہے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ حالی بھی بزرگانِ ادب میں ہیں اس لئے ان کے خلاف کچھ کہنا کفر ہے اور چونکہ میں اس کفر کا مرتکب ہوا مجھے زمرۂ مومنین سے خارج سمجھا گیا تو بات یہ ہے کہ میں نے حالی کی اسی قدر تعریف کی جس کے وہ مستحق تھے اور شاید اس سے زیادہ تعریف ان کے مداحوں نے بھی نہیں کی

ہے دیکھئے:

" اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہئیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانے اپنے ماحول میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اُردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی۔ ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے۔ ان کا خلوص زبردست ہے"

اور دیکھئے: " ان کا کارنامہ یہی ہے کہ وہ تا بمقدور مغربی ادب سے استفادہ کرنے میں منہمک ہو گئے، اور جو کچھ اچھا یا بُرا، تھوڑا یا بہت انہوں نے سیکھا اس کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا اور اس نئی روشنی میں اردو شاعری کو دیکھا اور اردو شاعری میں جو خامیاں نظر آئیں انہیں دُور کرنا چاہا۔ یعنی جو بات اور لوگ چاہتے تھے اور کہتے تھے اس کو انہوں نے عملی طور پر کر دکھایا اور یہی ان کی اہمیت ہے اور کسی میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ ان باتوں کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرے اور ان کو اُردو شاعری پر منطبق کرے" اور سنئے:

"دوسری بات یہ ہے کہ وہ کام کی باتیں کام کی زبان میں کرتے ہیں۔ حالی نے صاف اور سادہ طرز ادا ایجاد کیا، لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں، پھسپھسا پن نہیں۔ اس میں ایک لطافت ہے، ایک جاذبیت ہے، ایک رنگینی ہے اور پھر یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لئے موزوں بھی ہے ۔ ۔ ۔ حالی کی یہی خصوصیت ہے کہ انہوں نے نثر کو اپنایا، یا اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا کرنے میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ اور پھر اس نثر کو انفرادی خصوصیتیں عطا کیں اور اپنے انفرادی رنگ میں جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، اسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا اور یہی ان کی نثر کی ادبی اہمیت ہے"

شاید بیشتر حضرات کو تعجب ہوگا کہ میں نے یہ باتیں بھی کہی ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں اُردو تنقید میں موجود ہیں، لیکن قارئین کی نظر میں تو صرف ایک جملہ گھومتا ہے اور وہ یہ ہے: "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات"۔ اسی ایک جملے سے قارئین اس قدر برہم ہو جاتے ہیں کہ وہ اور کسی بات کو سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے اگر جو کچھ میں نے حالی سے متعلق لکھا ہے، اسے آپ غور سے پڑھیں تو آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ حالی ملٹن کا قول نقل کرتے ہیں:

Poetry should be simple, sensuous and passionate

اور اس کی تشریح کرتے ہیں، وہ کہتے تو ہیں کہ سادگی اضافی ہوتی ہے۔ لیکن جو سادگی کا معیار پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورہ اور روزمرّہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہو گی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطّل سمجھی جائے گی۔" وہ یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ شاعری ہمیشہ ان کی تعریف کے مطابق simple نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ یہ simple ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ورڈزورتھ کی یہ سطریں:

Will no one tell me what she sings ?
Perhaps the plaintive numbers flow
For old, unhappy, far-off things
And battles long ago.
Or is it some more humble lay,
Familiar matter of today,
Some natural sorrow, loss or pain
That has been and may be again.

یا شیکسپیر کی یہ سطریں جب King Lear ٹریجڈی کے نقطۂ عروج پر کہتا ہے۔

Pray you, undo this button. Thank you sir

لیکن ملٹن کی نظم Comus سے Comus کی مشہور تقریر کی یہ سطریں لیجئے جس میں وہ Lady کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا چاہتا ہے۔

Wherefore did Nature poure her bounties forth
With such a full and unwithdrawing hand,
Covering the earth with odours, fruits and flocks
Thronging the seas with spawn innumerable,
But all to please and sate the curious taste?

And set to work millions of spinning worms
That in their green shop weave the smooth-haired silk
To deck her sons; and that no corner might
Be vacant of her plenty, in her own loins
She hutched the all worshipped ore and precious gems
To store her children with.

اس پر simple کا اطلاق نہیں ہوتا اور اگر حالی ان سطروں یا ان جیسی سطروں سے واقف ہوتے تو انہیں sensuous کے معنی سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی اور وہ اس کا ترجمہ اصلیت نہ کرتے۔ اس کا مفہوم حسی یا حیاتی ہے، یعنی حواس خمسہ کی تیزی ہے۔ اِردگرد کی چیزوں سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ جو اس مثال میں واضح طور پر موجود ہے۔

یہ ایک مختصر اقتباس ہے۔ لیکن اسے آپ غور سے پڑھیں، تو آپ پر sensuous کے معنی واضح ہو جائیں گے، جو حالی پر واضح نہیں تھے۔ یہ spawn ، یہ 'odours 'fruits and flock اور خصوصاً innumerable

millions of spinning worms

That in their green shop weave the smooth-haired silk

یہ smooth haired silk جسے انگریزی میں tactile image کہتے ہیں۔ اور ان سب کے علاوہ سونا اور جواہرات۔ غرض ان سطروں میں آپ کے حواس خمسہ کی انگیزش اور تشفی کے سارے سامان موجود ہیں اور ملٹن کی sensuous سے یہی مراد تھی اصلیت نہیں۔ اس کے علاوہ ان سطروں کو آپ simple بھی نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ simple کے لئے نئے معانی وضع کرنے ہوں گے۔

پھر اگر کہا جائے کہ حالی کے خیالات ماخوذ تھے، واقفیت محدود تھی۔ کیونکہ انہوں نے کسی سے ملٹن کا یہ جملہ تو سن لیا تھا، لیکن ملٹن کی نظموں تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ نظر سطحی تھی وہ سنی سنائی باتوں کی سطح پر پھیلتی تھی ان کی تہوں کو ٹٹول نہیں سکتی تھی۔ فہم و ادراک معمولی اور غور و فکر ادنیٰ تھے ورنہ تہہ دار باتیں کہتے اور جو باتیں میں نے کہی ہیں وہی باتیں احتشام صاحب نے بھی آزاد و حالی سے متعلق کہی ہیں۔ سنیئے :

"آزاد و حالی کی کچھ مجبوریاں اور معذوریاں ہیں، وہ مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود آگے بہت دور تک نہیں جاتے، کچھ تو اس لئے کہ ان کو شعری اصول تنقید سے واقفیت بہت کم ہے۔ کچھ اس لئے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی معمولی اصطلاحات سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ آزاد تو بزرگوں کا ادب اس حد تک کرنا چاہتے تھے کہ جب ان کی خامیاں نکالنے کا وقت آتا تو ان کی زبان گنگ ہو جاتی تھی اور حالی پر ایک اخلاقی نقطۂ نظر اس طرح مسلط تھا کہ وہ کسی قیمت پر اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے بلکہ شاید یوں کہنا بہتر ہو گا کہ انہوں نے شعر کی حسین دیوی کو اخلاق کی چٹان سے باندھ رکھا تھا اسی طرح (وہ) عملی تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے اپنے انداز میں انہوں نے مختلف شعرا کے کلام کا تجزیہ کیا حالانکہ سوا معمولی اشاروں کے کہیں بھی یہ شعرا کے خیالات کی بنیادوں یا شعور کے سرچشموں تک نہ پہنچ سکے اور نہ اسے واضح شکل میں زندگی کے میلانات سے متعلق کر سکے۔ تجزیہ کی یہ کمی ان علوم سے ناواقفیت یا سطحی واقفیت کی غمازی کرتی ہے تنقید میں جن کی ضرورت ہے۔"

میں ساری باتیں نقل کر کے آپ کا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا لیکن جیسا کہ میں نے اردو تنقید میں لکھا ہے۔ احتشام صاحب کی باتوں کا ماحصل یہ ہے:

"آزاد، حالی، شبلی، مغربی اصولی تنقید سے واقفیت بہت کم رکھتے تھے۔ سوا معمولی اشاروں کے کہیں بھی یہ شعراء کے خیالات کی بنیادوں یا شعور کے سرچشموں تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ ان علوم سے ناواقف تھے جن کی تنقید میں ضرورت پڑتی ہے۔ دوسرے نقادوں نے بھی ایسے اصول نہیں بتائے جو شمع راہ بن سکیں یا جنہیں آگے بڑھنے کے لئے بنیاد بنایا جا سکے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر چھوٹی یا بڑی چمکتی ہوئی چنگاریاں ہیں، جو شعلہ نہیں بنتیں۔ بعض باتوں کی طرف معمولی اشارے اور بات ہے اور مکمل یا واضح تجزیہ اور استدلال کی کسوٹی پر پورا اترنے والا تنقیدی نقطۂ نظر دوسری بات۔ اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو کیا یہ کہنا ہٹ دھرمی نہیں کہ اردو تنقید کی ابتدا بلکہ شاندار ابتدا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہوئی۔ ان باتوں سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے جدید تنقید میں معمولی اشارے البتہ ملتے ہیں لیکن استدلال کی کسوٹی پر اترنے والا تنقیدی نقطۂ نظر نہیں ملتا اور مکمل اور واضح اور استدلال کی کسوٹی پر پورے اترنے والے اصول تنقید بھی نہیں ملتے یعنی اردو میں تنقید معشوق کی موہوم کمر ہے۔

احتشام صاحب یہ سب کہہ چکنے کے بعد کہتے ہیں کہ تنقید بھی ہے اور کم بھی ۔ یہ شاید ترقی پسند نقادوں اور ان کے معاصرین کی کوششوں کی بنا پر۔ لیکن ان لوگوں سے نپٹنے سے پہلے ایک دو لفظ میں عبدالحق صاحب کے بارے میں بھی کہہ دوں ۔ میں نے عبدالحق صاحب پر کافی تفصیل سے لکھا ہے اور ابتدا ہی میں انہوں نے اُردو زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمت کی ہے اس کا اعتراف کیا ہے اور میں نے لکھا ہے :

"عبدالحق صاحب پختہ کار ہیں ۔ وہ عجلت سے کام نہیں لیتے ہیں ۔ محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے وہ عموماً اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں اور جب تک بات کی تہ تک نہیں پہنچ جاتے ہیں، رائے زنی نہیں کرتے ہیں ۔ اپنی حدود کے اندر ذوق صحیح رکھتے ہیں ۔ اچھے بُرے کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے ہیں وسعت نظر بھی موجود ہے ۔ مغربی ادبوں سے تو واقفیت نہیں، لیکن مغربی اصول تحقیق سے واقفیت ہے ۔ جزئیات سے کافی شغف ہے اور معمولی سی معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں"

اور میں نے مثالیں دے کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان کی تنقید میں تجزیاتی تنقید کے نمونے ملتے ہیں، جو حالی میں نہیں ہونے کے برابر ہیں ۔ لیکن چونکہ میں نے دو باتیں کہہ دیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اور جن سے عبدالحق صاحب کی حدود کا تعیّن ہوتا ہے ۔ اس لئے مجھ پر برہمی ہوتی ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے :

"عبدالحق صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے ۔ وہ انگریزی سے واقف ہیں، حالی سے کچھ زیادہ ہی واقف ہیں، اگر وہ چاہتے تو انگریزی ادب، مغربی اصول تنقید سے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے ۔ اس واقفیت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے یہ واقفیت حاصل نہ کی یہی ان کی بڑی کمی ہے اور اسی وجہ سے ان کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے ۔ وہ مشرقی ادب کو محدود اور مقامی مشرقی نظر سے جانچتے ہیں ۔"

یہ بات اچھی ہو یا بری اس سے قطع نظر، اس کی صحت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ کیا آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ عبدالحق صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے ؟ کیا آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ عبدالحق صاحب حالی سے زیادہ انگریزی ادب سے واقف تھے ؟ کیا آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ انگریزی ادب سے واقفیت کو ضروری سمجھتے تھے ؟ کیا آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ اس واقفیت کو ضروری سمجھتے ہوئے بھی یہ واقفیت حاصل نہ کر سکے ؟

یاد ہوگا کہ اس کے پہلے حصے میں میں نے Eliot کے اس جملہ criticism is as inevitable as breathing کی تشریح کی تھی اور اس کی اہمیت بتائی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ شاید خود الیٹ کو اس جملہ کی معنی خیزی سے پوری واقفیت نہیں تھی۔ اس پر احتشام صاحب نے اپنی برہمی ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ اس معمولی سے جملے میں اپنے معانی پروئے ہیں۔ اور اب کوئی صاحب یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ Eliot سے بہت پہلے Dryden نے کہا تھا To breathe is to criticise جیسے یہ کوئی revelation ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ نہ تو ڈرائیڈن اور نہ الیٹ نے اس بات کی وضاحت کی اور جو باتیں میں نے کہی ہیں وہ بالکل نئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ان باتوں سے متفق نہ ہوں یا آپ انہیں لغو سمجھیں لیکن یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ باتیں میں نے نکالی ہیں۔ ان کی خبر نہ تو ڈرائیڈن کو تھی اور نہ الیٹ کو تھی۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں کئی حصے ہیں جن میں تنقید اور تعلیم، تنقید اور دماغی صحت، تنقید اور کلچر وغیرہ پر پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ساری باتیں نظریاتی ہیں، اصولی ہیں اور مجھے کہنے دیجئے کہ اردو تنقید کے لئے بالکل نئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میرا ارادہ فنِ تنقید پر ایک کتاب لکھنے کا تھا اور "تنقید کیا ہے" اس کتاب کا مقدمہ ہوتا۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے میں یہ بھی کہہ دوں کہ ایک اور تعمیری کام جو میں نے کیا وہ معیاری تبصرہ کا نمونہ پیش کر کے۔ یہ نہیں کہ میں نے تبصرہ لکھنے کی ابتدا کی۔ لیکن پہلے تبصرے جو لکھے جاتے تھے وہ عموماً یا تو تقریظ ہوتے یا تنقیص یا کچھ گول قسم کے بیانات۔ میں نے پہلی بار یہ بتانے کی کوشش کی کہ تبصرہ بھی تنقید کی ایک شاخ ہے جو پڑھ کے لکھا جائے وہی تبصرہ ہے۔ جو غور و فکر کے بعد لکھا جائے وہی تبصرہ ہے۔ جس میں زیر نظر تصنیف کا تنقیدی تجزیہ ہے، وہی تبصرہ ہے، جس میں تصنیف کی جانچ پرکھ ہے، اس کی خوبیوں یا خامیوں کے متعلق فیصلہ ہے وہی تبصرہ ہے۔ چار تبصرے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا تبصرہ تھا پنڈت کیفی کی مثنوی "جگ بیتی" پر۔ دوسرا عظمت اللہ خاں کی کتاب "سریلے بول" پر۔ تیسرا فراق کی مشہور کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" پر اور چوتھا آصف علی صاحب کی "پرچھائیں" پر۔ انہیں پڑھیے اور دیکھئے کہ تبصرہ بھی ایک فن اور مشکل فن ہے۔ "سخنہائے گفتنی" کے ان حصوں کے بعد میں ایک تحریر کا اور ذکر کر دوں۔ ابھی بیگم صالحہ عابد حسین کی دعوت پر میں نے سید ین موریل لکچرز دیئے تھے۔ دو لکچر تھے۔ پہلا لکچر نظریوں سے متعلق تھا جیسا کہ آپ جانتے ہیں الیٹ نے کہا ہے کہ ادبی تنقید کی دو حدیں ہیں۔ ایک حد تو یہ سوال ہے کہ شاعری کیا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے۔ یہ کیوں لکھی پڑھی سنی سنائی جاتی ہے۔ مقصد شاعری

کی تعریف نہیں سوال یہ ہے کہ شاعری اور زندگی میں کیا تعلق ہے، زندگی اور سماج میں شاعری کی کیا جگہ ہے؟ میں نے پہلے لکچر میں انہی اصولی باتوں سے دست وگریباں ہونے کی کوشش کی ہے اور جو باتیں میں نے کہی ہیں ان سے آپ اتفاق کریں یا نہ کریں انہیں پڑھ لینے کے بعد آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ میں آرٹ یا ادب یا شاعری سے متعلق کوئی نظریہ نہیں رکھتا اور اپنا سارا وقت تجزیاتی تنقید میں صرف کرتا ہوں یہ کہنے کا حق تو آپ کو اب بھی نہیں ہے۔ اگر آپ نے عملی تنقید پڑھی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے عملی تنقید پڑھی ہے انہوں نے بھی اس کے مقدمہ کو نہیں پڑھا ہے اور اگر پڑھا ہے تو اس کی طرف دھیان نہیں دیا ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا اہم حصہ مقدمہ ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ لوگ مقدمے کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کتاب کے متن پر سارا وقت صرف کر دیتے ہیں جس میں صرف تجزیاتی تنقید یا تقابلی تنقید ہے اور شاید یہ خیال بھی ان کے دل میں نہیں ہوتا کہ جو تجزیہ یا تقابل کیا گیا ہے وہ کس اصول کے پیش نظر ہے اور جو اصول پیش نظر ہے ہیں انہیں کی وضاحت مقدمہ میں کی گئی ہے۔ اگر مقدمہ نہ ہوتا تو کتاب کا بقیہ حصہ بے معنی ہوتا، اس کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ اس لئے میں کہوں گا کہ آپ متن کتاب کو بالکل بھول جائیں اور دھیان دیں تو صرف مقدمہ پر کیونکہ اگر میں نے اپنی دوسری کتابوں میں صرف تجزیاتی تنقید کی ہے (گرچہ یہ درست نہیں جیسا کہ میں مثالیں دے کر ثابت کر چکا ہوں) تو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا مقدمہ بھی صرف تجزیاتی تنقید ہے۔ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ "میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ عملی تنقید ہے"۔ انہوں نے اپنے اس خیال کی توجیہہ نہیں کی ہے لیکن غالباً وجہ یہی ہے کہ اس میں اصول تنقید کا واضح، معین، بسیط بیان ہے اور بیان ایسی صاف، سادہ آسان زبان میں ہے کہ سرسری طور پر پڑھنے والوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ کیسی تہ دار، کیسی نئی (اردو تنقید کے لئے) کیسی فکر انگیز باتیں کہی جا رہی ہیں اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تلخیص یہ ہے۔

"دیکھنا یہ چاہئے کہ شاعر کیا کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے۔ کیا یعنی مضمون = تاثر، ذہنی نقش یا خیال اور کیسا یعنی اسلوب = نقوش (تشبیہات و استعارات)، الفاظ، آہنگ، لب ولہجہ۔ ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے یعنی کیا اور کیسے مضمون اور الفاظ کچھ ایسے گھل مل جاتے ہیں، ان میں کچھ ایسا کیمیاوی تغیر ہو جاتا ہے کہ ان کے میل سے ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ دوئی وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیا کی اہمیت اس لئے ہے کہ شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے اور اس کی باتوں میں

ایک لطف ہوتا ہے، ایک تازگی ہوتی ہے، ایک یکتائی ہوتی ہے، یہ خوبیاں روزمرہ کی باتوں میں نہیں ہوتیں۔ اگر شاعر وہی کہے جو ہم آپ کہہ سکتے ہیں، اگر اس کے تجربے ایسے ہوں جن سے ہم اپنی زندگی میں دوچار ہوتے ہیں تو پھر ہم اس کے شعروں کو کیوں سنیں۔ شعروں میں نئی باتیں ہوتی ہیں، کام کی باتیں ہوتی ہیں، پُر لطف باتیں ہوتی ہیں ان میں رنگین و زریں تجربے ہوتے ہیں، جن سے دل و دماغ کو نئی گرمی اور روشنی ملتی ہے۔ جن سے زندگی بارونق ہو جاتی ہے۔ ہاں تو زیادہ سے زیادہ شعروں میں کوئی تاثر، کوئی احساس کوئی جذبہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ شاعر ہم آپ جیسا انسان تو ضرور ہوتا ہے لیکن کچھ غیر معمولی قسم کا۔ بے حسی سے اس کو دور کا واسطہ نہیں وہ کسی حساس آلہ کی طرح تھرتھراتا رہتا ہے اور ہونے والے واقعات اس پر برابر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ یعنی قوت حاسّہ کے ذریعہ اثرات وحسیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے دل میں بوقلموں جذبات اور کوائف اُبھرتے اور رنگین اور دلکش تجربات گزرتے رہتے ہیں۔" پھر میں نے بتایا ہے شاعر کے تجربوں کو وہ خیال کی صورت میں ہوں، ذہنی نقش کی صورت میں ہوں یا تاثر کی صورت میں ہوں کیسے جانچ پرکھ کی جائے، کیسے ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ کیسے بھرے بکروں میں فرق کیا جائے۔ یہ بحث تقریباً ۴۴ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور ہر بات کے لئے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ شعروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تقابلی تنقید کی گئی ہے جنہیں آپ عملی تنقید میں دیکھ سکتے ہیں۔ جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) شعر میں ایک تجربہ ہوتا ہے، یگانہ دیکھنا۔ یہ یاد رہے کہ شعر ہی تجربہ ہے۔

(۲) یہ تجربہ کوئی خیال ہو سکتا ہے، کوئی ذہنی نقش ہو سکتا ہے یا کوئی احساس یا جذبہ۔

(۳) تجربہ اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی، قیمتی بھی اور کم قیمت بھی۔

(۴) یہ تجربہ اگر خیال ہے تو اس میں نیاپن، باریکی، گہرائی، پیچیدگی لازمی شرطیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں ہیں، تو اس تجربے سے ذہنی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔ اگر خیال معمولی قسم کا ہے، پیش پا افتادہ ہے، شعرا کی عام ملکیت میں ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں ہو پاتی تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

(۵) اگر کسی ذہنی نقش میں (وہ تشبیہہ و استعارہ کے روپ میں ہو یا آزاد ہو) نئی بات پیدا کی گئی ہو، اس سے نیا کام لیا گیا ہو، اس کے ذریعہ کوئی نئی بات کہی گئی ہو یا پرانی باتوں سے نئی بات نکالی گئی ہو، اگر اس میں احساس کی تیزی نے نئی جان ڈال دی ہو، یا وہ نقش نیا ہو جس کا شمار عام ملکیت میں نہ ہو۔ ان

صورتوں میں سے کوئی صورت ہو تو نقش کامیاب ہے ورنہ نہیں۔ بنے بنائے نقوش جو شاعری کے عام رائج سکے ہیں، اپنی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں رکھتے اور اگر ان میں آورد ہے، کھینچ تان ہے، دور از کار صنعتیں ہیں تو بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

(۶) اگر تجربہ کوئی احساس یا جذبہ ہے تو بے حسی، خامی، عمومیت، سطحیت، چھچھورا پن، سستے اور بازاری قسم کا ہونا ـــــ یہ عیوب اس کی بے لطفی کا سبب بن جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس میں خلوص ہو، اصلیت ہو، سچائی ہو، تازگی ہو، لطافت یا تیزی ہو، شدت یا گہرائی ہو، پیچیدگی ہو ـــ یعنی مختلف اثرات، احساس اور جذبات کو ملا کر ایک نیا پیٹرن بنایا گیا ہو۔ اس کیا کے بعد کیسے کی بات آتی ہے اور کیسے میں جیسا کہ میں نے کہا ہے چار اجزا ہوتے ہیں: (۱) نقوش (۲) الفاظ (۳) آہنگ (۴) لب و لہجہ۔ نقوش بذات خود بھی اہم ہو سکتے ہیں اور ان کی اہمیت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ ان سے کوئی خاص کام لیا گیا ہے۔ لیکن ابھی زیر بحث یہ بات ہے کہ وہ کس کام آتے ہیں۔ شعر میں ان کی کاریگری کس قسم کی ہوتی ہے۔ میں نے کسی جگہ کہا ہے شعری تجربہ کا بیان براہ راست نہیں بالواسطہ ہوتا ہے۔ اگر کہنا ہو کہ میں سویا ہوا تھا یا میری روح سوئی ہوئی تھی تو ورڈز ورتھ کہتا ہے میری روح پر نیند نے مہر لگا دی تھی اور نقش بیکار نہیں با کار ہوتا ہے۔ یہ کوئی زیور یا آرائش نہیں ہوتا بلکہ تجربے کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ کبھی یہ نقوش باکار نہیں ہوتے، کبھی یہ زیور یا آرائش کا کام دیتے ہیں۔ کبھی یہ بذات خود اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، کبھی یہ تجربے کا جزو نہیں بن پاتے اور اس کے حسن، اس کی لطافت اس کی پیچیدگی میں اضافہ نہیں کرتے ہیں۔ میں نے مثالیں دے کر یہ باتیں واضح کر دی ہیں۔ نتیجہ یہی ہے کہ نقوش میں اگر کوئی خامی رہ جاتی ہے تو بذات خود اچھا ہوتے ہوئے بھی ان کا اثر، ان کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ شعر میں وسعت کم ہوتی ہے اس لئے نقوش کو زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا ہے اس لئے شعروں میں جو نقوش ملتے ہیں ان میں پھیلاؤ نہیں ہوتا پیچیدگی نہیں ہوتی۔ نظموں میں پھیلاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، پیچیدگی آجاتی ہے اور جذبات کی رنگینی اور زرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ تو نقوش کی بات رہی اب کیسے کے دوسرے جزو کو لیجئے یعنی الفاظ۔ شعر لفظوں سے بنتا ہے۔ شاعر کچھ کہتا ہے وہ خیال ہو، ذہنی نقش ہو یا تاثر ہو اور جو وہ کہتا ہے وہ لفظوں میں کہتا ہے اور لفظوں ہی میں کہہ سکتا ہے۔ وہ رنگوں یا سروں یا پتھر سے کام نہیں لیتا اور نہ لے سکتا ہے۔ اس لئے شعر میں لفظوں کی

اہمیت ظاہر ہے۔ اگر الفاظ نہ ہوں تو شعر کا وجود بھی ممکن نہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ شعر خاص خاص لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظوں کا ہر مجموعہ شعر نہیں ہوتا، اگر ہم ان دو باتوں کو دھیان میں رکھیں تو تنقید کے کام میں بہت سہولت ہو جائے گی وہ دونوں باتیں یہ ہیں :

(۱) شعر خاص لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

(۲) لفظوں کا ہر مجموعہ شعر نہیں ہوتا۔

شعر تجربہ ہے، شعر میں تجربے کا بیان ہوتا ہے لفظوں کی زبانی۔ الفاظ تجربہ کو بیان کرتے ہیں، تجربہ میں اضافہ یا تبدیلی کرتے ہیں اور بذات خود تجربہ بھی ہوتے ہیں۔ کوئی خیال، ذہنی نقش یا احساس شاعر کو متاثر کرتا ہے۔ اس خیال، ذہنی نقش یا احساس میں زور تو ہوتا ہے لیکن وضاحت نہیں ہوتی۔ یہ کچھ مبہم اور غیر متعین سا ہوتا ہے۔ لفظوں میں جب کسی تجربہ کا بیان ہوتا ہے، تو اس میں وضاحت آجاتی ہے، اس میں اضافہ ہوتا ہے، تبدیلی ہوتی ہے، نئے نئے تجربے آتے ہیں اور اس کی پیچیدگی، رنگینی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے گویا اس کی صورت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں کہی جا چکی ہیں لیکن ان پر بار بار زور دینا ضروری ہے۔ ورنہ شعر میں لفظوں کی جو جگہ ہے، جو اہمیت ہے، جو جادوگری ہے، وہ نمایاں نہیں ہو پاتی۔ جگر کا ایک شعر ہے :

تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے

شعر میں کچھ اسی طرح کی بات ہوتی ہے۔ تجربہ رفتہ رفتہ لفظوں کی مدد سے سراپا بن جاتا ہے۔ جو چیز غیر مرئی تھی وہ مجسم ہو جاتی ہے۔

شعر میں لفظوں کی اہمیت کیا ہے اسے پوری طرح سے سمجھنے کے لئے دو متضاد حقیقتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک طرف تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ لفظوں کی کوئی اپنی ادبی خصوصیت نہیں ہوتی وہ نہ تو حسین ہوتے ہیں اور نہ تو بدصورت، نہ تو خوشگوار ہوتے ہیں اور نہ مکروہ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعری لفظ اور نثری لفظ میں فرق ہوتا ہے۔ آسمان زمین کا فرق ہوتا ہے۔ نثری لفظ چپٹا اور مفید ہوتا ہے اسے دوسری طرح سے بھی کام میں لایا جا سکتا ہے لیکن شعری لفظ آپ اپنا وجود ہے اور ایک دنیائے معانی اس میں پنہاں ہوتی ہے۔ ہر شعری لفظ غالب کے لفظوں میں گنجینۂ معانی کا طلسم ہوتا ہے۔ پھر ہر لفظ کا ایک پیکر ہوتا ہے۔ اسے بولتے ہیں تو اس کی ساخت کو ہم منہ میں محسوس کرتے ہیں، سنتے ہیں تو ایک خاص پیکر کا احساس ہوتا ہے،

سوچتے ہیں تو آنکھوں کو، اندرونی آنکھوں کو، اس کا صوری پیکر نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر لفظ کا ایک پیکر ہوتا ہے اور یہ پیکر کئی پیکروں سے مل کر بنتا ہے۔ اس کی مختلف کیفیتوں کو اپنے حواس خمسہ کی مدد سے ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ مرئی بھی اور صوتی بھی، اسے ہم چھو سکتے اور سونگھ بھی سکتے ہیں اور زبان ولب سے اس کی ساخت کا لطف بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر لفظ میں ایک مخصوص جوہر ہوتا ہے جو دوسرے لفظوں میں نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کئی الفاظ ہم معنی ہوں لیکن ہر لفظ کی ایک انفرادی خصوصیت ہوتی ہے، جو اس کے مرادف لفظوں میں نہیں پائی جاتی۔ ہر لفظ کی اپنی ایک ذہنی اور جذباتی فضا ہوتی ہے، ہر لفظ کا ایک ذہنی پس منظر ہوتا ہے۔ ہر لفظ میں احساس کی ایک مخصوص لہر پوشیدہ ہوتی ہے لیکن احساس کی بے حسی، خیال کی کم نظری، تخئیل کی سستی کی وجہ سے گنجینۂ معنی تک رسائی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ چپٹے ہو جاتے ہیں۔ مختلف معانی گویا گھس کر ایک شکل کے بنا دیے جاتے ہیں۔ ان کی انفرادیت مٹ جاتی ہے اور ان پر ایک قسم کی مفلسی سی چھا جاتی ہے۔ ان میں جو فطری رنگینی یا زرینی ہے وہ مٹ جاتی ہے اور وہ مجلس شعر میں مفلس کے چراغ کی طرح شام ہی سے بجھے بجھے سے دکھائی دیتے ہیں۔ الفاظ کے بعد آہنگ کی باری آتی ہے۔ یوں تو شعر میں وزن ہوتا ہے لیکن وزن ایک ہوتے ہوئے بھی آہنگ مختلف ہو سکتا ہے۔ اس لئے وزن کی زیادہ اہمیت نہیں جو چیز اہم ہے وہ لفظوں کی موجِ خرام ہے۔ لفظوں کا چلتا پھرتا جلوس ہے وہ ہمیشہ بدلتا ہوا متحرک نظام ہے، جو ہمیشہ نئے نئے ڈھنگ سے حسن خرام کے نئے نئے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے Rhythm یہ وزن نہیں کچھ اور چیز ہے وزن کو metre کہتے ہیں۔ اردو میں Rhythm کو آہنگ کہتے ہیں۔ دشواری یہ ہے کہ اردو میں آہنگ کا تصور ذرا مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دو شعروں میں وزن ایک ہو لیکن آہنگ مختلف ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ لفظوں کا رقص مختلف ہوتا ہے اور یہ فرق اس لئے ہے کہ لفظوں کے حروف۔ وہ حرف صحیح ہو یا حرف علت ۔ کی آواز الگ الگ ہے اور دو شعر یا دو مصرعوں میں حروف کا پیٹرن ایک نہیں ہو سکتا۔ پھر لفظوں کا بوقلموں مجموعہ بنتا ہے اور یہ الفاظ کبھی آہستہ چلتے ہیں تو کبھی تیز تیز۔ کبھی بہکتے ہیں تو کبھی لڑکھڑاتے ہیں اور کبھی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھتے ہیں اس لئے نغمہ اور رقص دونوں لحاظ سے اثر بدلتا رہتا ہے۔

وزن، آہنگ حرکت کے بعد لہجے کی بات آتی ہے۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے Tone اور شعر میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ شاعر کچھ کہتا ہے اور اس کے کہنے کا ایک خاص لہجہ ہوتا ہے ایک

حد تک یہ لہجہ شاعر کی شخصیت پر منحصر ہے۔ شخصیت ہی کی بنا پر تجربوں کی تشکیل ہوتی ہے اور جس لہجہ میں شاعر بات کرتا ہے اس میں اس کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ میر کی شخصیت سودا سے مختلف تھی اس لئے ان کے لہجوں میں مشابہت ممکن نہ تھی لیکن ابھی یہ فرق زیر بحث نہیں۔ بات یہ ہے شعر میں جن تجربوں کا بیان ہوتا ہے ان کی جذباتی سطح بدلتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کا اثر لہجہ میں بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ کبھی لہجہ بلند ہوتا ہے تو کبھی دھیما ہو جاتا ہے، کبھی بات آہستہ آہستہ ہوتی ہے تو کبھی لہجہ میں تیزی آجاتی ہے کبھی نرمی ہوتی ہے تو کبھی کرختگی، کبھی شیرینی ہوتی ہے تو کبھی تیکھا پن غرض حرکت سے قطع نظر لہجہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور جذبات کا مدوجزر برابر اثر ڈالتا رہتا ہے۔ میں نے کہا ہے تجربے کو ایک چشمہ سمجھئے۔ اس چشمے کا پانی ایک طرح سے نہیں بہتا۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ سے کبھی ایسا نرم سیر ہو جاتا ہے کہ جیسے تصویر آب ہو، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں، تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی رہتی ہے، کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ کا ابھار ہوتا ہے، کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے، تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے۔

میں نے تقریباً دو سو صفحوں کو چھ صفحوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے بھی آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں نے اصولی باتیں کی ہیں اصول منضبط کئے ہیں، کمی صرف یہ ہے کہ مثالیں میں نے صرف غزلوں سے دی ہیں۔ چونکہ میرا ارادہ دو اور جلدیں لکھنے کا تھا، جلد دوم میں قصیدوں، مثنویوں اور مرثیوں سے بحث ہوتی اور تیسری جلد میں نظموں سے لیکن اصول وہی ہیں جو میں نے پہلی جلد کے مقدمے میں بیان کئے ہیں۔ یہ حقیقت مثل روز روشن ہے کہ میں نے صرف دوسرے نقادوں پر نکتہ چینیاں نہیں کی ہیں بلکہ مثبت باتیں کی ہیں اور کیا ہونا چاہیئے یعنی اصول تنقید پر اس کتاب میں مفصل بحث کی اور دوسری کتابوں میں بھی اصولی باتوں سے متعلق اجمالی لیکن واضح اشاروں کی کمی نہیں۔

۳

'اُردو شاعری'، 'اُردو تنقید'، 'سخنہائے گفتنی' اور 'عملی تنقید' کو آپ دیکھ چکے۔ اب "اردو زبان اور فن داستان گوئی" کو دیکھئے۔ اس کی میری نظر میں زیادہ اہمیت نہیں لیکن اسے عموماً نظر استحسان سے دیکھا گیا۔ یوں سرور صاحب نے لکھا، جادو پر ایمان کون لائے" اور گیان چند صاحب نے کچھ اعتراضات کئے جن میں کچھ غلط فہمی پر مبنی ہیں اور کچھ اختلاف رائے ہے جس کا انہیں حق حاصل ہے لیکن عام طور پر انہوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے خصوصاً اس کے اسلوب کی۔ دو تین جملوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔

(۱) کلیم الدین صاحب نے اس کتاب میں کئی جگہ انسانی نفسیات اور سماجی زندگی کی ایسی حسین حقیقتیں واشگاف کی ہیں کہ انہیں پڑھ کر وجد آتا ہے۔

(۲) دو تین مثالوں سے قطع نظر کتاب زبان و بیان کے لحاظ سے بے داغ ہے۔ کلیم الدین احمد صاحب پر کوئی مقالہ لکھا جائے تو اس میں زیر نظر کتاب کو اہم مقام دینا ہوگا۔

(۳) کلیم الدین احمد صاحب کی اس کتاب نے داستان جیسی فرسودہ صنف کو اُردو ادب میں اس کا مقام دلایا۔ اس صنف پر یہ ان کا سب سے بڑا احسان ہے۔

بہر کیف۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کتاب کے خلاف وہ شدید ردعمل نہیں ہوا جیسا 'اُردو شاعری' اور 'اُردو تنقید' کے خلاف ہوا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اس میں تخریبی یا منفی تنقید نہیں تھی اور "غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے" یا "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" جیسے کھٹکتے ہوئے جملے نہیں تھے۔ پہلے میں چند باتیں واضح کر دوں جن سے کچھ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ "فن داستان گوئی" تحقیقی کتاب نہیں۔ یہ اُردو کی اہم داستانوں کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے فارسی originals سے واسطہ نہیں رکھا ہے۔ صرف اُردو داستانوں سے۔ تیسری بات یہ ہے کہ میں نے کہا ہے کہ لکھنؤ میں داستان گوئی کا چرچا تھا۔ لیکن میں نے کبھی نہیں لکھا کہ

طلسم ہوشربا یا باغ و بہار، فسانۂ عجائب یا گلزار نسیم تحریری داستانیں نہ تھیں۔ میں نے جاہ کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں جس کا پہلا مصرع ہے: لکھی جو اے جاہ داستاں یہ عجب مزے کی حکایتیں ہیں۔ اگر یہ باتیں ذہن میں رہیں تو بہت سے اعتراضات بے محل ثابت ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے یہاں بھی یہ شکایت ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں ہیں۔ چند جملوں کو متن سے الگ کرکے ان پر اعتراض کرنا اصولی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی کو اختلاف ہو تو اسے پورے باب کو پڑھنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ all of a piece ہے یا نہیں۔ اسی طرح جہاں میں نے عیاروں کو موجودہ زمانے کی secret service کہا ہے اس میں سے کسی ایک حصّہ کو لے کر اعتراض کرنا درست نہیں۔ یہ تو درست ہے اور اس کا میں نے اعتراف بھی کیا ہے کہ داستان نویس کا تخیل پر زور ہے لیکن اس کا execution کمزور ہوتا ہے۔ اسی طرح میں نے کنگ آرتھر اور اس کے نائٹوں کا امیر حمزہ اور ان کے جانبازوں سے مقابلہ کیا ہے۔ اسے بھی لوگ سمجھ نہیں پائے ہیں حالانکہ معنی بالکل واضح ہے۔ دیکھئے "آرتھر محض ایک انگریزی بادشاہ نہیں وہ ایک مخصوص بہادر، مہذب فیاض ہستی نہیں۔ وہ نیکی کا حمایتی ہے۔ دیو، اژدہے، بدکار نائٹ جن سے وہ جنگ آزما ہوتا ہے بھی بدی کے مجسمے ہیں اور جو معرکے ہوتے ہیں وہ معنی خیز ہیں۔ ان میں نیکی اور بدی، روشنی اور تاریکی سفیدی اور سیاہی کی کشمکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہی بات طلسم ہوش ربا میں بھی ملتی ہے۔ امیر حمزہ اور ان کے سردار نیکی کے پتلے اور نیکی کے حمایتی ہیں۔ افراسیاب اور اس کے سردار و مددگار دراصل بدی کی طاقتیں ہیں اور نیکی بدی کی طاقتوں میں زبردست تصادم ہوتا ہے" مماثلت بس اسی قدر ہے۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ all of a piece ہوتا ہے۔ اس کے ایک حصے سے بحث کرنا درست نہیں۔ اب اسے کیا کیجئے۔ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا۔

بہرکیف۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس کتاب کو لوگوں نے نظر تحسین سے دیکھا۔ گرچہ اس کے بعض حصوں سے بہت جز بز بھی ہوئے۔ گیان چند صاحب جنہیں اس کتاب کی بعض باتوں سے سخت اختلاف ہے پھر بھی کہتے ہیں:

> "اردو زبان اور فن داستان گوئی اردو داستانوں کے موضوع پر
> پہلی بھرپور تنقیدی کتاب ہے ———"

مجنوں گورکھپوری نے اپنے کتابچہ 'افسانہ' میں داستانوں کے بارے میں

مختصراً لکھا تھا اور فوق الفطرت داستانوں کو سراہا تھا لیکن کلیم الدین صاحب نے داستانوں کی اس شد و مد سے قدر شناسی کی کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی اُردو ادب میں صنف داستان کو اس کا جائز مقام حاصل ہوا۔ ان کے بعد اس موضوع پر کئی تحقیقی مقالے، کئی دوسری کتابیں لکھی گئیں جن میں سے بعض ابھی تک لباس طبع سے محروم ہیں۔"

ظاہر ہے کہ میں نے پہلی بار اُردو کے اس قیمتی سرمایہ کی طرف لوگوں کی توجہ کو مبذول کیا۔ جو سرمایہ گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا اور جسے لوگ بھول چکے تھے یا بھول چلے تھے پھر اس سرمایہ کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے قارئین کو باخبر کیا اور یہ بھی کہا:

"داستانوں کا یہ سرمایہ کسی دوسری زبان کی داستانوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ کسی دوسری زبان کے سرمایہ کے مقابلے میں ہیچ نہیں۔ لیکن یہ تو اُردو دنیا کا شیوہ ہے کہ اچھی چیزوں سے واقفیت نہیں اور کم قیمت چیزوں کی تشہیر کی جاتی ہے۔"

جہاں میں نے داستان کی خوبیوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے وہاں میں نے یہ بھی لکھا ہے:

"یہ فطرت کا قانون ہے کہ زمانے کے تغیرات کے ساتھ ہماری ضرورتیں بدل جاتی ہیں اور نئی نئی چیزیں ہماری دلچسپی اور تشفی کا سامان ہوتی ہیں۔ ادب میں بھی یہی قانون جاری و ساری ہے۔ بعض صنفیں زمانے کے تقاضے کے مطابق پرانی ہوجاتی ہیں اور انہیں ہم پس پشت ڈال دیتے ہیں اور نئی صنفیں ایجاد کرتے ہیں۔ مثلاً ایپک اب کوئی نہیں لکھتا مدت سے یہ صنف ادب بے کار پڑی ہے۔ اسی طرح داستان گوئی بھی اب زندہ صنف ادب نہیں رہی۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ کوئی کامیاب فنی کارنامہ پرانا یا مردہ نہیں ہوتا۔ ہومر کی ایلیڈ، دانتے کی ڈوائن کومیڈی، شیکسپیر اور راسین کے ڈرامے آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اسی طرح داستان نویسی اب زندہ فن نہ سہی لیکن کامیاب داستانیں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ انہیں ہم مردہ سمجھ کر دفن نہیں کرسکتے۔ خصوصاً اردو ادب کا سرمایہ کچھ اتنا زیادہ نہیں کہ ہم ان داستانوں کو حقیر سمجھ کر انہیں ادب کے

زمرے سے خارج کر دیں۔"

ان سطروں میں سے کچھ سطریں نقل کر کے گیان چند صاحب لکھتے ہیں:

"آخری دو اقتباسات میں انہوں نے ادب کے تغیرات اور قارئین ادب کی مزاج دانی کے کمل ادراک کا ثبوت دیا ہے۔ پھر آخر کتاب میں وہ یہ تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ آج کے قارئین افسانوں اور ناولوں کو چھوڑ کر (داستانوں میں) ڈوب جائیں۔"

میں نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ قارئین افسانوں اور ناولوں کو چھوڑ کر داستانوں میں ڈوب جائیں۔ جو میں نے لکھا تھا وہ یہ ہے:

"داستان کی جگہ پہلے ناول اور پھر مختصر افسانے نے لے لی ہے۔ اُردو داستان تو ختم ہو چکی اور ناول بھی دم توڑ رہا ہے۔ آج کل کچھ لوگوں نے ہمت کی ہے اور ناول کو صحت مند بنانے کی کوشش کی ہے لیکن نتیجہ تشفی بخش نہیں۔ جہاں غزل کو بہترین صنف شاعری اور شعر مفرد کو شاعری کی معراج شمار کیا جاتا ہو، وہاں ناول جیسی مشکل صنف میں کامیابی معلوم! ناول کے لئے کچھ نہیں تو کافی طویل محنت اور دماغ سوزی کی ضرورت ہے اور طبیعت اس کی عادی نہیں۔ اس لئے کام میں ہر قسم کے جھول رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو میں سب سے زیادہ مقبول عام شئے مختصر افسانہ ہے۔ جو شہرت غزل کی تھی وہی اب افسانے کی ہے۔ جیسے پہلے لوگ غزل لکھتے اور پڑھتے تھے آج افسانے لکھتے اور پڑھتے ہیں ... ... اور ہمارے انشار پرداز اس صورت حال سے بظاہر مطمئن ہیں لیکن مجھے اطمینان کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

یہ باتیں ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھیں اور جو ناول اور افسانے اس وقت لکھے گئے تھے ان سے میں نے اپنی بے اطمینانی ظاہر کی تھی اور بس۔ جہاں تک داستان کا تعلق ہے میں نے صرف یہ کہا تھا — اور ان جملوں کو گیان چند صاحب نے حذف کر دیا تھا کہ "کوئی کامیاب فنی کارنامہ پرانا یا مردہ نہیں ہوتا ... ... داستان گوئی اب زندہ فن نہیں لیکن کامیاب داستانیں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔"

کسی پر اعتراض کرنے سے پہلے اس کی پوری باتوں کو سمجھ لینا چاہیئے لیکن جہاں ریزہ خیالی عین فطرت ہو اسے خیالات کے گھسے ہوئے پیٹرن سے ہٹنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔

میرے خیال میں "فن داستان گوئی" کی اہمیت تاریخی ہے اور کچھ تنقیدی بھی۔ تاریخی اس لئے کہ یہ اُردو داستانوں کے موضوع پر پہلی بھرپور کتاب ہے۔ تنقیدی اس لئے کہ داستانوں کے بہت ایسے گوشے جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے، وہ پہلی بار منور ہو گئے اور بہت سی ایسی باتیں جنہیں داستانوں کا عیب سمجھا جاتا ہے وہ حسن نظر آنے لگیں۔ ایک دوسری اہم بات میں نے کہی تھی اس کی طرف افسوس کہ کسی نے توجہ نہ کی اور وہ یہ کہ اگر اُردو انشاپرداز داستان امیر حمزہ کی طرف توجہ کرتے تو انہیں بے شمار نقوش، تصاویر، تلمیحات پر دسترس ہوتی اور ان چیزوں سے مصرف لے کر وہ اپنی تصنیفوں کو سجا سکتے تھے۔ ہر زبان میں اساطیر اور داستانوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ شعراء اور انشاپرداز اس ذخیرے کی قیمتی چیزوں کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں ...... یونانی اساطیر، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں اور ان کی دلچسپ کہانیوں کا اثر یورپ کے ہر ادب میں نمایاں ہے۔ اُردو میں داستان امیر حمزہ خصوصاً طلسم ہوش رُبا سے یہی کام لیا جا سکتا ہے اور اگر مصرف لیا جاتا تو اُردو ادب اور اردو زبان میں ایک جان پڑ جاتی لیکن اردو ادب میں داستان امیر حمزہ سے گویا بالکل عدم واقفیت ظاہر ہوتی ہے شاید کہیں ایک آدھ مثال مل جائے۔ ع سینہ میرا غم گیتی سے عمرو کی زنبیل۔ لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک عمرو کو لیجے۔ ان کی صورت، ان کی زنبیل، گلیم عیاری، جال الیاسی، ان کا لحن داؤدی، ان کی بخالت اور خصوصاً ان کی حیرت انگیز عیاریوں سے ہم بیشمار نقوش واستعارے اختراع کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ داستان امیر حمزہ سے مختلف قصے لے کر سیدھی سادی آسان زبان میں کامل اختصار کے ساتھ بچوں کے لئے لکھے جائیں۔ اس طرح یہ چیزیں ہماری زبان، ہمارے شعور میں رچ جائیں گی پھر بہ آسانی یہ ادب کا جزو بن جائیں گی۔

اب فن داستان گوئی کو یہیں چھوڑیئے۔ میں نے چار تذکرے بھی شائع کئے ہیں۔ پہلا دیوان جہاں ہے۔ اس کی شان نزول یہ تھی کہ میں پرنسپل پٹنہ کالج تھا۔ کسی صاحب کو ــــــ اب نام یاد نہیں، اس کی ضرورت ہوئی اور کہا کہ اسے Royal Asiatic Society سے منگوا دیجئے۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو لکھا اور انہوں نے بھیج دیا۔ میں نے بھی اسے دیکھا اور گرچہ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن اس کا ہندوستان میں واحد نسخہ Royal Asiatic Society میں تھا۔ میں نے سوچا اسے شائع کر دیا جائے۔ ان دنوں میں Current Studies نکالا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک خصوصی اڈیشن نکال کر نقل بصورت اصل کے طور پر شائع کر دیا۔ مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ اس کا متن لوگوں کو آسانی سے

رل جائے۔ اب سُنئے۔ ابتدا میں میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں جس میں کریم کا قول نقل کیا تھا۔ کریم نے
اس تذکرہ کی تاریخ ترتیب غلط دی تھی۔ ۱۸۴۸ء۔ اور میں اس سے واقف تھا، اسی لئے میں نے اس
تذکرہ کے آخری صفحہ کی عکسی تصویر دے دی تھی جس میں صحیح تاریخ ۱۸۴۲ء صاف دی ہوئی تھی۔ سالہاسال
بعد ہمارے دوست عطاء الرحمٰن صاحب نے غلطیہائے مضامین میں اس بات کی نشاندہی کی کہ کریم نے غلط
تاریخ دی ہے اور تصحیح ضروری تھی۔ اگر وہ آخری صفحہ کی عکسی تصویر دیکھ لیتے تو اعتراض کی ضرورت محسوس
نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ اڈیسن کی طرح میرے مخاطب وہی قارئین ہیں جنہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری
باتیں غور سے پڑھتے اور سمجھتے ہیں اس لئے میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی "دو تذکرے" ہے جس میں تذکرہ شورش اور تذکرۂ عشقی کے اندراجات
کو آمنے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ایک نئی راہ نکالی گئی ہے۔ مجھے تو نہیں معلوم کہ مجھ سے پہلے کسی نے
دو یا دو سے زیادہ تذکروں کو اس طرح پیش کیا ہو۔ سید حسن صاحب نے لکھا ہے:

"ابھی کلیم صاحب کی تنقیدی تالیفات کے متعلق لوگ بحث و مباحثے میں
مشغول ہی تھے کہ یکایک تنقید کے مکان سے نکل کر تحقیق کے اسٹیج پر نمودار ہو گئے اور ان
کی بغل میں ان کی نئی تالیف دو تذکرے تھی۔ یہ کتاب ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ ہے اگرچہ
اس میں تحقیقی مواد قدرے قلیل ہے لیکن اس کتاب نے تحقیق کی دنیا میں ایک نئی روش
ایجاد کی جس کی اور بھی دوسرے محققین نے تقلید کی ہے۔ تذکرۂ شورش اور تذکرۂ عشقی
کو ایک ساتھ اس طرح شائع کرنے کا کہ ایک شاعر کے متعلق دونوں تذکرہ نگاروں کے
بیانات آمنے سامنے کے صفحوں پر ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ دونوں تذکروں کے اختلافات نمایاں
ہو جائیں اور قارئین خود فرق معلوم کر لیں۔ دونوں تذکروں کے زمانۂ تالیف میں تقریباً پچیس سال کا
فاصلہ ہے۔ اس فاصلے نے کیا فرق پیدا کیا ہے اور دونوں تذکرہ نگاروں کے طرز نگارش
اور موضوع کو پیش کرنے کے خاص طریقے کیا ہیں ان باتوں کی کلیم صاحب نے وضاحت نہیں
کی ہے بلکہ انہیں خود قاری کو سمجھنے اور سوچنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس کتاب کو مکمل تحقیقی
کارنامہ اس لئے بھی نہیں کہہ سکتے کہ تذکرہ نگاروں نے کسی شاعر کے متعلق جو معلومات
فراہم کی ہیں وہ کہاں تک صحیح یا غلط ہیں ان کو جانچنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔"

سید حسن صاحب نے میرا مقصد سمجھا بھی ہے اور نہیں بھی سمجھا ہے۔ میرا مقصد تحقیق نہیں تھا۔ میرا مقصد اسی قدر تھا کہ "دونوں تذکروں کے اختلافات نمایاں ہو جائیں اور قارئین خود فرق معلوم کر لیں"۔ دونوں تذکروں کے زمانۂ تالیف میں تقریباً پچیس سال کا فاصلہ ہے۔ اس لئے فطری طور پر اس فاصلے نے فرق پیدا کیا ہے اور پھر دونوں تذکرہ نگاروں کے طرز نگارش اور موضوع کو پیش کرنے کے خاص طریقوں میں بیّن فرق ہے۔ اس لئے میں نے ان کی تفصیل ضروری نہیں سمجھی بلکہ قارئین کے ذوق صحیح پر بھروسا کر کے ان باتوں کو انہی کو سمجھنے اور سوچنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ یہ تحقیقی نہیں تنقیدی کارنامہ ہے اور اس میں محققوں کی عام ڈگر سے ہٹ کر الگ راہ نکالی گئی ہے اس لئے سید حسن صاحب کا یہ اعتراض غیر متعلق ہے کہ یہ مکمل تحقیقی کارنامہ اس لئے بھی نہیں کہ تذکرہ نگاروں نے کسی شاعر کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں یا غلط، میں ان کو جانچنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

اس سلسلے کی چوتھی کڑی گلزار ابراہیم ہے اور بقول سید حسن صاحب "کلیم صاحب کا یہ بھی اُردو ادب پر ایک بڑا احسان ہے۔ گلزار ابراہیم کو ایڈٹ کرنے میں البتہ کاوش کی گئی ہے۔ پہلے تو کلیم صاحب نے پورے تذکرے کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا اور پھر دو قلمی نسخوں اور گلشن ہند سے مقابلہ کر کے اس کا متن درست کیا۔ اس کے مقدمے میں تحقیق سے خاصا کام لیا گیا ہے۔ اس تذکرے کی خصوصیات کی نشاندہی اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ تذکرہ رسالہ معاصر کے دو خصوصی شماروں میں شائع ہوا ہے"۔

میں یہ بات واضح کر دوں کہ ان چار تذکروں کی اشاعت محض اتفاقی امر ہے۔ 'دیوان جہاں' کیسے اور کس مقصد سے شائع ہوا اس کی میں نے تشریح کر دی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی فرمائش پر میں نے تذکرۂ شورش اور تذکرۂ عشقی کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے لئے منگوائی تھیں اور مجھے امید تھی کہ قاضی صاحب ان دو تذکروں کی طرف توجہ خاص کریں گے۔ جب انہوں نے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے توجہ نہ کی تو مجھے خیال ہوا کہ یہ دونوں عظیم آبادی تذکرے ہیں اور ان کی ترتیب میں تقریباً پچیس سال کا فرق ہے۔ میں نے یہ ترکیب سوچی کہ کیوں نہ مشترک شعرا کے حالات کو آمنے سامنے شائع کر دیا جائے۔ اس طرح شائع کرنے سے بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی جو انہیں الگ الگ پڑھنے سے واضح نہیں ہوتیں۔ اسی لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ورنہ میں انہیں

علاحدہ علاحدہ بھی شائع کر سکتا تھا اور میں نے قارئین کی سمجھ پر بھروسا کیا کہ جو فرق ہے وہ اسے خود دیکھ لیں گے۔ وہ شعرا کے حالات میں ہو، اشعار میں ہو، طرز نگارش میں ہو یا واقعات کو پیش کرنے کے طریقے میں۔ میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ جو کچھ میں لکھوں اس سے قارئین سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ نہیں کہ جو بات کہی جائے اسے وہ بغیر غور و فکر مان لیں۔ میں نے قصداً یہ دکھانے کی کوشش نہ کی کہ ان تذکروں میں تذکرہ نگاروں نے کسی شاعر کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کہاں تک صحیح یا غلط ہیں۔ یہ کوئی omission نہیں بلکہ ارادی ہے اور سید حسن صاحب کو اس کی وجہ کا بھی تھوڑا بہت علم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"درحقیقت کلیم صاحب نے سارے تذکروں کو جمع کر کے ان کے ذریعہ اردو شاعروں کا ایک ایسا تذکرہ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو سارے تذکروں کا نچوڑ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔"

سید محمد حسنین کو بھی میرے اس منصوبے کا علم تھا۔ لکھتے ہیں:

"ان کے شوق تحقیق کا ایک شاندار و بے مثال نمونہ تذکروں کا ایک قارونی گنجینہ ہے۔ ان کے پاس شعرائے ریختہ کے تقریباً کل معروف و گمنام، قلمی نیز مطبوعہ تذکروں کا ذخیرہ جمع ہے۔ ان تذکروں کی دستیابی و فراہمی میں کلیم الدین نے حیرت ناک مستعدی دکھائی اور جانفشانی اٹھائی ہے۔ کچھ تذکروں کی عکسی نقلیں زر کثیر خرچ کر کے لندن اور برلن سے منگوائی ہیں۔ دو چار تذکرے ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان کی نیند حرام کر ڈالی ہے۔ راتوں رات جاگ کر ان کی نقل اُتارنے میں کلیم الدین نے خاندانی اور پیدائشی کاتبوں کے بھی کان کاٹ دیئے ہیں۔"

مبالغے سے قطع نظر، میرا ارادہ تھا کہ سارے تذکروں کو اکٹھا کر کے ہر شاعر کے جو حالات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں انہیں ترتیب وار جمع کر دیا جائے۔ اور ان کے شعروں کو بھی۔ اس طرح اگر آپ یہ جاننا چاہتے کہ کسی شاعر سے متعلق تذکروں میں کیا معلومات ہیں اور ان کے کون سے اشعار نقل کئے گئے ہیں تو وہ بیک نظر آپ کو مل جاتے۔ پھر یہ بھی ارادہ تھا کہ چار پانچ جلدوں میں ان تذکرہ نگاروں کے حالات اور ان کے تذکروں پر مفصل تنقید بھی کی جائے اور یہ کام بہت آگے بڑھا بھی تھا۔ تقریباً سارے مطبوعہ تذکرے اور قلمی تذکروں کی نقلیں یا ان کے فوٹو اسٹیٹ میں نے جمع کر لئے تھے اور ۷۵ فی صد کام ختم بھی ہو گیا تھا لیکن ۱۹۷۵ء کے سیلاب میں جہاں میری ساری لائبریری تباہ ہو گئی وہاں یہ موٹی موٹی فائلیں برباد ہو گئیں اور اب نہ اتنی

مہلتِ عمر ہے اور نہ اتنی سکت باقی ہے کہ دوبارہ اس کام کو شروع کیا جائے۔

سید حسن صاحب نے میری ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے وہ ہے تاریخِ نور۔ وہ کہتے ہیں:

"کلیم صاحب کا ایک اور تحقیقی کارنامہ تاریخ نور کی اشاعت ہے جو معاصر کے ایک شمارے میں شامل ہے۔ تاریخ نور سابق نواب اودھ واجد علی شاہ کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنی محبوبہ نواب نور زماں بیگم کو لکھے تھے۔ کلیم صاحب نے اس کے دو نفیس نسخوں کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس میں ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا ہے جس سے کلیم صاحب کے تحقیقی انداز نظر کا پتہ چلتا ہے۔"

سید حسن صاحب کے اس بیان میں ایک غلطی ہے۔ تاریخِ نور میں نے اس کے "دو نفیس نسخوں کی مدد سے" مرتب نہیں کی ہے۔ تاریخ نور کے صرف ایک واحد نسخے کا مجھے علم ہے جو میری ملکیت ہے اور میں نے مسعود حسن رضوی صاحب سے بھی دریافت کیا تھا کہ ان کی نظر سے اس کا کوئی دوسرا نسخہ گذرا ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا واحد نسخہ میں نے آپ ہی کے گھر میں دیکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ 'تاریخ نور' خطوط کے دو مجموعوں کا نام ہے۔ پہلا مجموعہ تو وہی ہے جسے میں نے ایڈٹ کیا ہے جس میں واجد علی شاہ کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے نواب نور زماں بیگم کو لکھے تھے۔ اسی نام کا دوسرا نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، جس میں وہ خطوط ہیں جو نواب نور زماں بیگم نے واجد علی شاہ کو لکھے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان خطوط کو بھی شائع کر دوں اور اس کی نقل بھی محبوب حسین صاحب نے کی تھی لیکن بات یہ تھی کہ نواب نور زماں بیگم ناخواندہ تھی اور یہ خطوط اس کے لکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس کی طرف سے اس کے رشتہ داروں نے لکھے تھے۔ اسی لئے میں نے اسے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ایک بات اور کہہ دوں۔ میں نے تاریخ نور کی ایک کاپی محترمی قاضی عبدالودود صاحب کو بھی دی۔ اسی کے بعد دائرۂ ادب کی میٹنگ تھی، اس میں قاضی صاحب فرمانے لگے کہ واجد علی شاہ نہایت لچر آدمی تھا۔ اس کی دو سو بیبیاں تھیں۔ میں نے کہا وہ لچر آدمی سہی لیکن جو کچھ اپنے مقدمے میں میں نے لکھا ہے وہ تاریخی ریسرچ پر مبنی ہے۔ یہ کتاب مجھے ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت سے ملی تھی اور یہ واحد کتاب واجد علی شاہ پر تھی جس میں ان دستاویزوں سے مدد لی گئی تھی اور اقتباسات پیش کئے گئے تھے جو آج بھی National Archives میں محفوظ ہیں۔ بات یہ تھی کہ انگریزوں نے واجد علی شاہ کے سامنے ایک Treaty کا مسودہ

پیش کیا تھا جس کی رو سے وہ Titular King رہتے اور ان کے سارے اخراجات انہیں ملتے رہتے۔ صرف سلطنت کے انتظامی امور Administration پر انگریزوں کا کامل دخل ہوتا۔ واجد علی شاہ نے تخت چھوڑنا پسند کیا لیکن اس Treaty پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص بالکل لچر نہیں ہوتا اور نہ کوئی شخص کامل ہوتا ہے۔ ایک لچر آدمی بھی جرأت یا ہوشمندی کا کام کر سکتا ہے اور ایک بظاہر کامل آدمی سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور جہاں تک دو سو بیویوں کا سروکار ہے تو ہندوستان کے راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے یہاں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ آخر شرر نے دربار حرام پور کس لیے لکھا۔

بہرکیف! ان کتابوں سے زیادہ اہم میں تین مضامین، کو سمجھتا ہوں جو ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں: (۱) تذکروں کی جنگ' (۲) 'شاعروں کی نوک جھونک' (۳) 'شاعر لوگ'۔ میں نے کہا ہے کہ تذکروں میں شاعر کی زندگی، شخصیت، تنقید اور اس کے نمونۂ کلام کے علاوہ اور بھی دلچسپ باتیں ملتی ہیں جیسے سیاسی، تاریخی یا معاشرتی اشارے یا تصویریں اور ان کے علاوہ شاعروں سے متعلق بہت سے دلچسپ قصے بھی ملتے ہیں۔ لیکن لوگ تذکروں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور ان سے اپنے کام کے اقتباسات لے لیتے ہیں۔ جو لوگ تذکروں کو ایڈٹ کرتے ہیں ان کی توجہ بھی ان باتوں کی طرف نہیں جاتی، یا جاتی ہے تو کم جاتی ہے، یا وہ ان کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں۔

سید حسن صاحب نے دو مقالوں کا ذکر کیا ہے۔ شاعروں کی نوک جھونک اور شاعر لوگ۔ غالباً پہلا مقالہ جو ان دو مقالوں سے پہلے شبخون میں شائع ہوا تھا ان کی نظر سے نہیں گذرا۔ یہ مقالہ مجھ سے مظہر امام صاحب نے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب مدیر شبخون کو بھیج دیا تھا اور انہوں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ کسی نے اس طرح تذکروں پر نظر نہیں ڈالی ہے۔ یہ مقالہ اس وقت پیش نظر نہیں کیونکہ شبخون کی کاپی تو نذر سیلاب ہو گئی اور تلاش کے باوجود مجھے شبخون کا وہ شمارہ ابھی تک نہیں مل سکا ہے جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ بہرکیف اپنی یاد کی بنا پر میں کچھ باتیں اس مقالے سے متعلق کہوں گا۔

میر نے نکات الشعراء کیا لکھی کہ اس کا ردعمل فوری ہوا اور تا دیر قائم رہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جہاں میر نے بہت سے شاعروں کی تعریف و تحسین کی تھی، وہاں انہوں نے بعض شعراء کی تنقیص بھی کی تھی۔ مثلاً:-

(۱) خاکسار- شعر ریختہ می گوید و خود را دورمی کشد و بسیار سفلگی می کند بلکہ از تنک آبی بنلائے ریختہ را آب رسانیدہ۔

(۲) ثاقب- در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند۔

(۳) یکرو:- دو سہ مرتبہ در مجالس ریختہ دیدہ ام باآنکہ ہیچمدان فن ریختہ بود لیکن خود را ہمہ داں می شمرد۔

یہ تو عام باتیں تھیں۔ میر خاص خاص نکتوں پر بھی اپنی رائے دیتے ہیں: مثلاً:

(۱) حاتم: دیکھو طور اس دور کا حاتم ہیں کی ترک شراب یاد کر کر سبز رویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

پھر لکھتے ہیں: در لفظ سبز رویان تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشنائے گوش ہیچمدان نیست۔

(۲) محمد شاکر ناجی: دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم لب صدف کے تر نہیں ہر چند گوہر آب میں

میر کہتے ہیں: بر متامل پوشیدہ نیست کہ پیش مصرع این چنیں می بائیست ع مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خورد کی۔

(۳) یقین: مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو کیا عیش دے گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

میر کہتے ہیں: اگر بجائے خوش نصیبی خوش معاشی می گفت این شعر بسیار با مزہ می باشد۔

اس قسم کے اور بہت سے اعتراضات تھے لیکن میر کا اصل جرم یہ تھا کہ انہوں نے یقین سے متعلق لکھا تھا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یقین کو مرزا مظہر جان جاناں غزلیں لکھ کر دے دیا کرتے ہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ یقین سے لوگوں نے غزل کہنے کی فرمائش کی لیکن وہ ایک شعر بھی موزوں نہ کر سکے۔

اس قسم کے اعتراضات سے ان شعرا کے احباب فطری طور پر برافروختہ ہوئے۔ خصوصاً یقین پر جو انہوں نے حملہ بول دیا تھا اس کا شدید ردعمل ہوا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ فتح علی حسینی نے فوراً "نکات الشعرا" کا جواب لکھا۔ میر کا ذکر نہیں کیا لیکن روئے سخن میر کی طرف ہے کہتے ہیں کہ: تذکرہ ہائے اخوان زمان' کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تالیف کی علت غائی "خردہ گیری ہمسراں و ستم ظریفی با معاصر انست" انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ایک تذکرہ لکھیں جس کی بنا انصاف پر ہو۔ بہر کیف مقصد جو کچھ بھی ہو ان کے تذکرے کی بنا نکات الشعرا پر ہے اور اکثر شعرا کے ترجمے انہوں نے نکات الشعرا سے نقل کر لیے ہیں اور اپنے دوست یقین کی تعریف، مبالغہ آمیز تعریف کی ہے اور میر کے رتبے کو کم کرنا چاہا ہے۔ میر کے

متعلق وہ صرف اسی قدر لکھتے ہیں :

"فقیر سیر اشعارش نمودہ وچشمے آب دادہ۔ حقا کہ دراں تلاش معنیٔ بیگانہ کردہ است وحرف آشنا را برویٔ کار آوردہ۔"

انہیں لفظوں میں حشمت کا بھی ذکر ہوتا ہے اور جہاں سجاد کے کلام کا نمونہ گیارہ صفحوں میں پیش کیا گیا ہے وہاں میر کا صرف ایک مبتذل شعر نقل کیا گیا ہے۔

جب نکات الشعرا حیدر آباد پہنچی اور شفیق کی نظر سے گذری جو یقین کا مداح تھا۔ اس نے میر پر سخت اعتراضات کئے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں، نکات الشعرا کا ایک ردعمل تذکرۂ شورش میں بھی ہے۔ ایک مختصر سے اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔

"میر۔ شاعر بے نظیر محمد تقی میر تخلص شاگرد خانِ آرزو متوطن اکبر آباد فی الحال در شاہجہان آباد تشریف می دارند و فخر شاعران دہلی خود را می دانند چنانچہ در تذکرۂ خود شعر شاعرانِ ہندوستان غلط تلاش نمودہ، مرقوم ساختہ۔ اگر غلط بدست نیامدہ تاہم اعتراض بیجا و اصلاح خود جاری نمودہ و زندہ و مردہ کسے را بسلامت نہ گزاشتہ۔ بعضے اعزہ کہ از و مربوط بودند آن را محفوظ داشتہ۔ غرض عجب کسے است و در تذکرہ مذکور خود را سید نوشتہ اند، مردمان می گویند کہ شیخ است چنانچہ کسے گفتہ :

شیخ تقی نام ہو اور میر کہاوے

از وست :

میر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا ۔۔۔ جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

در مصرع اول قطع اضافت درست داشتہ اند نزدیک شاعران دہر درست نیست :-

یہ بھی ایجاد میر صاحب ہے

ازیں قبیل۔ نکات الشعرا کا ردعمل اور اس کے Reverberations آب حیات میں بھی ملتے ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں : "دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر ان لوگوں کا نام نہ لوں گا جن سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں :

"وے شاعریست از شیطان مشہورتر" پھر میر کی شخصیت کو بہت ناگوار بنا دیتے ہیں۔ ان کی خودپسندی، خودبینی، بدمزاجی، غرور کو اس قدر اُچھالا ہے کہ میر کی شخصیت ناگوار اور بدنما ہو گئی ہے۔ ایک مثال کافی ہے

"اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت تھی"

اختصار کے باوجود بھی مضمون لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تذکرہ گو بھی انسان تھے۔ ان میں انسانی کمزوریاں تھیں۔ آپس میں چشمکیں تھیں اور یہ چشمکیں تا دیر ہوتی رہیں۔

تذکرہ نگاروں کی طرح اور ان سے زیادہ شاعروں میں چشمکیں ہوتی رہیں۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی میرا لمبا مقالہ شاعروں کی نوک جھونک ہے۔ جس میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انگریزی میں جہاں اس طرح کی نوک جھونک کا نتیجہ کوئی فنی کارنامہ ہوتا ہے یا کوئی گہری تنقید، اُردو میں اس قسم کی چیز نہیں ملتی۔ مقالہ بہت طویل ہے۔ اس لئے میں صرف اپنے conclusions بیان کروں گا۔

شیلی نے Peter Bell the third لکھی اور اس میں کولرج اور ورڈزورتھ پر طنز کی لیکن یہ طنز، تنقید بھی تھی۔ ایک مثال دیکھئے۔ یہ کولرج ہے:

He was a mighty poet - and
A subtle - souled psychologist!
All things he seemed to understand
Of old or new - of sea or land
But his own mind which was a mist

He was a man who might have turned
Hell into Heaven aud so in gladness
A heaven unto himself have made
But he in shadows undiscerned
Trusted - and damned himself to madness

اگر آپ کولرج سے واقف ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں کولرج کی خوبیاں اور اس کی کمزوریاں دونوں کا بے مثل بیان ہے اردو شعرا کی صورت حال کچھ اور رہی۔ اس مقالے کے آخر میں ساری بحث کا میں نے خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ یہاں اس خلاصے کا بھی خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ولی اور ناصر کی نوک جھونک مشکوک ہے۔ مظہر جان جاناں اور آبرو کا معاملہ بھی کچھ یوں ہی سا ہے۔ ضاحک نے مظہر جان جاناں کی شان میں ہزل کہی۔ سودا نے البتہ جان جاناں کی زبان پر اعتراض کیا کہ یہ نہ فارسی ہے نہ ریختہ۔ ضاحک نے سودا کی ہجو کہی لیکن اس میں تنقید بس اسی قدر ہے۔ "فال کا قافیہ ہلال کرے۔ اور "بحر و تقطیع کی نہیں ہے خبر" سودا نے قائم کی ہجو میں کام کی بات صرف یہ کہی۔ اس کی سات بیتوں میں پانچ ہیں مبتذل بے معنی دو، اور مکین اور اس کے متبعین پر اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ تلازم الفاظ کے مہمل حد تک دیوانے تھے۔ ندرت کشمیری کی ہجووں میں اس کی زبان، لب و لہجہ تلفظ پر اعتراض ہے۔ لیکن سب سے زیادہ زور قلم سودا نے سبیل ہدایت میں صرف کیا جس میں ایک سلام اور ایک مرثیہ کی بالتفصیل خامیاں دکھلائیں۔ میر کا میدان ہجو نہ تھا۔ بقا کی ہجو میں بھی ادبی نکتے نہیں ملتے البتہ جام کے ساتھ ساتھ کچھ چھینٹے سودا پر بھی پڑ گئے ہیں۔ بقا نے میر پر سرقہ کا الزام لگایا اور سودا اور میر پر اعتراض کیا۔

شعر سودا و میر کے دیکھے وہ تو تو کریں ہیں یہ میں میں

مصحفی نے سودا کے خلاف خوب زہر اگلا — ان کی وفات کے بعد — سودا کم علم تھے فارسی دانی میں ناقص تھے۔ ان کی تعریف بازاریوں تک محدود تھی لیکن مصحفی نے مثالیں نہیں دیں اس لئے ان کی نکتہ چینی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سودا کے شاگردوں نے مصحفی کا جواب دیا ان کے شعروں پر اس قسم کے اعتراضات کئے جو اس زمانہ میں رائج تھے۔

مصحفی و انشا میں سخت نوک جھونک ہوئی بلکہ جھگڑا نوک جھونک کی حد سے بڑھ گیا۔ لیکن اس میں تنقید کا جزو نہ ہونے کے برابر تھا۔ البتہ گردن والی غزل پر نکتہ چینی ہوئی۔ انشا کی نکتہ چینی بس اسی قدر ہے:

بلور گو درست ہو لیکن ضرور کیا خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپائیے

اور مصحفی کی بھی اس قدر:

گردن کہ صراحی کے لئے وضع ہے ناداں بے جا ہے خم بادۂ انگور کی گردن

انشاؔ نے عظیم بیگ کے ایک مصرعے پر جو اعتراض کیا کہ دوسری بحر میں جا پڑا ہے: "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" اس کا جواب عظیم بیگ سے نہ بن پڑا۔ جراؔت اور نواؔ کے معارضے میں کوئی خاص بات نہیں۔ ناسخؔ و آتشؔ میں بھی نوک جھونک ہوئی اور خوب ہوئی لیکن مفید نکتے نہیں ملتے۔ ناسخؔ کے متبعین نے بقول آزاد جو اعتراضات آتشؔ پر کئے وہ کسی حد تک درست تھے لیکن ان کی نوعیت لفظی گرفت سے زیادہ نہیں۔ نمش، بیگم (بفتح کاف فارسی)، پیشگی وغیرہ۔ نصیرؔ و ذوقؔ میں بھی نوک جھونک ہوئی۔ لیکن نوعیت یہ تھی کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیئے، اس شعر میں روانی کا ثبوت نہیں ہے، پھول بٹوے میں ڈال کر نہیں بھیجتے، دونے میں ڈال کر زیادہ مناسب ہوگا۔ مومنؔ پر بھی اعتراضات ہوئے کہ شمر کو شمُر نظم کیا اور نوحہ زن کی نئی ترکیب استعمال کی۔ غالبؔ کی مشکل پسندی پر خوب لے دے ہوئی۔ حکیم آغا جان عیشؔ نے یہ قطعہ کہا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میرؔ سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور غالبؔ نے اس قسم کی ساری شکایتوں کا جواب ایک شعر میں دے دیا:

ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آپ نے دیکھا کہ شاعروں کی نوک جھونک میں کوئی خاص ادبی نکتے یا تنقیدی اشارے نہیں ملتے۔ ان کی شخصیت پر البتہ روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل میں میں سر دست جانا نہیں چاہتا۔

اس سلسلے کی تیسری کڑی "شاعر لوگ" (تذکروں کی روشنی میں) ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر سید حسن صاحب نے کہا کہ آپ نے character assassination کیا ہے۔ حالانکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے لے حسب دستور تذکروں سے متعدد اقتباسات دے کر ثابت کر دکھایا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اردو شاعروں کی زندگی کے نجی واقعات نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر۔ اس لئے جو حالات بھی مل جائیں ان کی اہمیت ظاہر ہے۔ اردو میں یہ شیوہ رہا ہے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطاست، اور پھر یہ بھی ہے کہ مُردوں کو خیر کے ساتھ یاد کرو اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے یہ طرز عمل کچھ اُردو ہی تک محدود نہیں۔ انیسویں صدی تک یورپ میں بھی پردہ داری ہوتی تھی۔ اچھی

باتوں کا اشتہار ہوتا تھا اور بُری باتوں کی پردہ داری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزرگوں کی خطاؤں، ان کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ پھر بھی جب یہ خطائیں حد سے گذر جاتی ہیں، جب ان کی کمزوریوں کا گلی کوچوں میں چرچا ہونے لگتا ہے، جب کجروی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ چھپائے نہیں بنتی تو اس کی طرف اشارہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تذکروں کی ورق گردانی کیجئے تو ایسے ہی کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ ان اشاروں کو نظر انداز کرنا حقیقت سے گریز کرنا ہے۔ ان اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے شعرا بھی "سیدھے اور تنگ رستے" سے بہت بھٹکتے رہے ہیں۔ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ فن کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کی شخصیتوں میں کیسے پیچ و خم پیدا ہو گئے ہیں وہ فن کے سہارے اُبھرتے ہیں، بلند پروازی کرتے ہیں اور پھر اسی فن کی بدولت قعر مذلت میں بھی گرتے ہیں۔

ایک میر کو لیجئے۔ ان کی شاعری ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ میر کی شخصیت میں بہت ساری ایسی کجرویاں تھیں جنہیں سراہنا مشکل ہے۔ ان کی بددماغی اور نازک مزاجی افسانہ بن گئی تھی جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ میر کو بھی اس بات کی خبر تھی:

ہے مجلسوں میں نام مرا میر بے دماغ　　　　از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

لیکن صرف یہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ Genius اور دیوانگی میں حد فاصل بہت کم ہے اور میر کے متعلق روایتیں ملتی ہیں کہ عنفوان جوانی میں وہ اپنے دماغ کا توازن کھو بیٹھے تھے۔ دوسری کجروی عشق سادہ رویاں تھی۔ میر خاکسار کے منظور نظر بھی تھے اور جن لفظوں میں وہ میر عبدالحی تاباں کا ذکر کرتے ہیں ان سے ان کی افتاد طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

شعروں میں جو عشق سادہ رویاں کی مثالیں ملتی ہیں وہ صرف رواج زمانہ کے مطابق نہیں۔ ان کی بنا حقیقت پر تھی۔ میرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ حسن و جمال بڑی پُر کیف تھی۔ ایک سے ایک حسین اور جمیل شاگرد اور حلقہ بگوش کا جمگھٹا رہتا۔ یقین، فقیہہ، دردمند، تاباں تو ان کے منظور نظر ہی تھے۔ میر عبدالحی تاباں معشوق عاشق مزاج تھے۔ بقول قاسم آخر ہائے روزہا امردانِ شیریں ادا و سادہ رویانِ ملاحت آما در خانہ وے بزور زیور آراستہ و پیراستہ می شوند حسب الطلب امرائے قزلباش درمہا فہا شستہ لشب مہمان می رفتند۔ اور تاباں خود بھی ایک سلیمان نام لڑکے پر عاشق تھے۔ میر احمد یار، ذکر، غلام احمد دوست، ذکی، رستم، رسوا، رضا، شوق، تمکین،

میر علی نقی کافر، سپاہی، شاغل، فدوی لاہوری، شاہ وارث الدین وارث، شاہ محمد واقف واقف، میر بھینگا، ثابت، محمد امام بخش دل، سید نور الحق منعم، خواجہ بخش منتظر، نور اللہ مرزا، میاں امانت۔ غرض کس کس کا نام لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عشق سادہ رویاں شہروں کی حدود سے گذر کر زندگی کا جزو بن گیا تھا اور لطف یہ ہے کہ تذکرہ نگار بھی اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ تذکروں میں ایسے حسین الفاظ اور ایسی رنگین عبارت کا استعمال ہوتا ہے جس سے لذتیت ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب فراق کے ہمنوا ہیں۔

"اور امرد پرستی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیونکہ خواہ آپ اسے غیر فطری کہیں، خواہ مکروہ اور ذلیل، خواہ آپ تعزیرات ہند کا سہارا لیں۔ یہ یاد رہے کہ جو لوگ امرد پرستی کے مرتکب رہے ہیں، وہ نہ تو خود جرائم پیشہ ہوتے ہیں، نہ ذلیل نہ رذیل، نہ کمینے نہ عام طور سے خراب آدمی ہوتے ہیں۔ بلکہ کئی امرد پرست تو اخلاق و تمدن اور روحانیت کی تاریخ کے مشاہیر رہے ہیں جیسے سقراط، سیزر، مائیکل اینجلو، سرمد، شیکسپیر، اور دنیا بھر میں جو لکھو کھا آدمی امرد پرست رہے ہیں، وہ نہایت شریف آدمی رہے ہیں۔"

اب ایک دوسری کجی کو لیجئے۔ سوسائٹی کا کچھ ایسا حال تھا کہ عشق اور ہوس پرستی میں کوئی فرق نہیں تھا جس طرح امرد پرستی کا رواج تھا اسی طرح ہوس پرستی عام ہو گئی تھی۔ یعنی ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ اُردو شاعروں کا معشوق بیسوا ہے اسی لئے اس کے چھن برے ہیں۔ جس قسم کے عشق کی رنگین داستانوں سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے وہ عشق extra-marital ہے۔ وہ غالب ہوں یا داغ، سبھی اسی عشق کی غزل خوانی کرتے ہیں:

غالب:
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

داغ:
بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں — کسی کی آج آئی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں اک دن رنگ لائیگا — قیامت بن کے اٹھیں گے بھبھوکا بن کے بیٹھے ہیں

اور صرف یہ شہروں تک محدود نہیں۔ یہ بوالہوسی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ میر ظفر علی آزاد، شیخ برکت اللہ فرید، میر حسین حسینی، مولوی سراللہ منعم، محمد عابد رخشاں، میر مہدی داغ، میر قمر الدین منت،

میر حسن، خواجہ حسن، احسن اللہ خاں احسن، شیخ ظہور الدین حاتم، فضائل علی خاں فضائل، جرأت، مومن، شیفتہ، غالب؛ ان کے علاوہ نہ جانے کتنے عشق پیشہ، حسن پرست، عیاش، اوباش، رند مشرب گذرے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں اشارے کافی ہیں۔ بوالہوسی کی طرح بادہ خواری کی مثالوں کی بھی کثرت ہے۔ عبدالحی تاباں کی ایک extreme مثال ہے لیکن تنہا نہیں۔ حیرت، سکندر، حاتم، رسوا، غالب، اقبال، دغیرہ وغیرہ۔ غرض اچھا شاعر اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھا انسان نہیں ہوتا۔ جلوس شاعراں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ امرد پرست، رند، عیاش، اوباش، قلندر، سروپا برہنہ، اندھے، بہرے، پاگل، جذامی، مخنث، ہزّال، غرض۔ گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن۔

میں نے ان تین مضامین 'تذکروں کی جنگ'، 'شاعروں کی نوک جھونک'، 'شاعر لوگ' کا ذکر کچھ تفصیل سے اس لئے کیا کہ ایک تو وہ ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یوں تو تذکروں کی ورق گردانی سبھی کرتے ہیں لیکن ان مضامین میں انداز نظر جدا ہے، طریق کار بھی جدا ہے اس لئے ان میں ایک قسم کا نیا پن ہے جو دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے۔

تنقید کے سلسلے میں صرف ایک اور کتاب کا ذکر کروں گا اور وہ کلیات شاد کا اڈیشن ہے۔ پرانے شعرا کے دواوین یوں تو تحقیقی کام کرنے والوں کا تختۂ مشق ہیں۔ عموماً طریقۂ کار یہ ہے کہ کسی شاعر کے دیوان کے جتنے نسخے مل سکے انہیں اکٹھا کیا اور اختلاف نسخ کی بصد احتیاط حواشی میں نشاندہی کی۔ مجھے اس طریقۂ کار میں بہت کچھ سعیٔ لاحاصل معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی نسخے اہمیت رکھتے ہیں جو شاعر نے خود لکھے ہوں یا جو اس کی نگرانی میں لکھے گئے ہوں، یا جو اس کی زندگی میں لکھے گئے ہوں یا زیادہ سے زیادہ جو اس کے قریبی دوستوں یا عزیز شاگردوں یا معاصرین نے لکھے ہوں یا ان کی نگرانی میں لکھے گئے ہوں۔ ورنہ ایسے نسخے جو نقل در نقل ہوں اور وہ بھی جو شاعر کی زندگی میں نہیں لکھے گئے ہوں ان کی کوئی خاص تحقیقی یا تنقیدی وقعت نہیں۔ یہ جانی ہوئی بات ہے کہ کاتب نقل کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ کچھ تو کام کی یکسانی کی وجہ سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور Sheer boredom کی وجہ سے توجہ بھی چوک جاتی ہے اور نظر بھی۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ ایک لمبے دیوان کو نقل کرنے میں غلطیوں کا ارتکاب فطری ہے کاتب کا ہاتھ اور قلم

دونوں تھک جاتے ہیں۔ یعنی یہ غلطیاں غیر شعوری ہوتی ہیں۔ کچھ غلطیاں شعوری بھی ہوتی ہیں۔ بعض کاتب قصداً تغیر و تبدل کر دیتے ہیں۔ خصوصاً پڑھے لکھے کاتب جان بوجھ کر شاعر کے کلام پر اصلاح کر دیتے ہیں۔ اس کے شعروں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اختلافات جو شعوری یا غیر شعوری طور پر کاتب کے زائیدہ ہوتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں اور ایسے اختلافات کو گنانا صرف وقت کی بربادی ہے۔ مثلاً خدابخش لائبریری میں راسخ کے دو نسخے ہیں۔ میں نے ایک نسخہ دیکھا جو اِن دو نسخوں میں سے ایک کی نقل ہے۔ اس نسخہ اور اریجنل نسخے میں کچھ اختلافات ہیں۔ لیکن یہ اختلاف صرف کاتب کے سہو قلم کا نتیجہ ہیں اس لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب اریجنل تک رسائی ممکن ہو تو پھر نقل کی طرف توجہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کاتب مصرع کا مصرع بدل دیتا ہے۔ دو شعروں سے ایک شعر بنا لیتا ہے۔ الفاظ کا رد و بدل تو اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ کاتب کی شعوری یا غیر شعوری تحریف کو نوٹ کرنا لاحاصل ہے۔ البتہ اگر اس بات کی نشاندہی کی جائے کہ کہاں کہاں غیر شعوری یا ارادی تحریف ہوئی ہے، تو وہ ایک مفید چیز ہو سکتی ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔

کلیات شاد میں مجھے حسن اتفاق سے سید نقی احمد ارشاد سے چند قابل وثوق نسخے مل گئے۔ ایک تو کلیات شاد جلد سوم بخط شاد، دوسرا ناقص نسخہ دیوان اول ہے جس میں شاد نے پہلی بار اپنی غزلوں کو ترتیب دیا تھا۔ تیسری چیز بیاض شاد مملوکہ پروفیسر ذکی الحق تھی جس میں شاد کے مراثی کی اولین شکلیں ہیں، لیکن کچھ غزلیں بھی ہیں۔ چوتھا نسخہ ریاض عمر کے دو جزء تھے۔ جو شاد نے خود شائع کئے تھے۔ لیکن دیوان دو جزء سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پانچواں نسخہ کلام شاد مع اصلاحات شاد۔ قاضی عبدالودود صاحب نے شاد کے منتخب کلام کی اشاعت کا ذمہ لیا تھا۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس پر شاد بہت برہم ہوئے تھے اور اس کے ایک نسخے کو بقول خود خرید کر انہوں نے اصلاحوں سے رنگ دیا تھا۔ چھٹا نسخہ دیوان ہفتم ہے جسے شاد کے بھانجوں نے کل سات دیوانوں سے ملا ملا کر اشعار ردیف الف کو مرتب کیا تھا۔ ساتواں مطبوعہ دیوان ناکمل مع فارسی دیباچہ ہے جس میں صرف آٹھ غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ اصلاحات ہیں جو شاہ عطاء الرحمن صاحب نے شاد کی زبانی سن کر قلم بند کر لی تھیں۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ یہاں کاتب درمیان نہیں اور زیادہ

سے زیادہ اختلافات جو درج کئے گئے ہیں وہ دراصل اصلاحیں ہیں جو شاد اپنے شعروں پر کرتے رہتے تھے۔

"عام نقطۂ نظر کے مطابق شاعر محض ایک ساز ہے جس کے پردے وجدان کی ہوا سے بجتے ہیں۔ وہ نغموں کا خالق نہیں ہے، محض ایک حساس آلہ ہے، تشنۂ مضراب ساز ہے اور جس کی تشنگی کو وجدان اپنے من کی موج کے مطابق رفع کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر حقیقت سے دور ہے۔ کم سے کم یہ پوری یا ادھوری حقیقت بھی نہیں۔ اگر شاعروں کے اوریجنل مسودوں کو دیکھا جائے تو یہ بات بیّن طور پر واضح ہو جائے گی کہ شاعر مجبور نہیں مختار ہے۔ وہ صرف وجدان پر بھروسا نہیں کرتا، بلکہ شعوری طور پر غور وفکر کرتا ہے، کاوش کرتا ہے، فنی نکتوں، بیان اور حسن بیان کی دشواریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انگریزی شعرا کے بہت سے اوریجنل مسودے محفوظ ہیں اور انہیں دیکھنے سے ان کی ذہنی کاوشوں کی تصویر اجاگر ہو جاتی ہے۔ کیسے اور کتنے مرحلوں سے گذر کر نظمیں اپنی آخری کامیاب صورتوں تک پہنچتی ہیں۔ الغرض شعر مسلسل ذہنی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ کلیات شاد سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑے گی۔ گرچہ سارا مواد نہ مل سکا لیکن جتنی اصلاحیں یا اختلافات حواشی میں درج ہیں۔ ان سے مسلسل شعری کوشش کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔ سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم وکیف حیات۔ کہہ سکتے ہیں کہ سعیٔ پیہم ترازوئے کم وکیف شاعری ہے۔ ان اصلاحوں کی اہمیت یہی ہے کہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ شاد سعیٔ پیہم کی اہمیت سے واقف تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ الغرض فن کارانہ حیثیت سے شعر کو انہوں نے اپنا آرٹ بنالیا تھا۔ یہ نہیں کہ شاد آرٹ برائے آرٹ کے قائل تھے۔ لیکن شاعری کو وہ ایک ریاضت سمجھتے تھے۔ ریاضت، جانکاہی، ہنر یہ الفاظ (اور ایسے بہت سے الفاظ ان کے شعروں میں بھی ملیں گے) اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں۔ ان میں بھی Tennyson کی طرح ایک قسم کا lapidarian discontent تھا۔ وہ تکمیل کے خواہاں تھے۔ خوب کو خوب تر بنانا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی ان کی کاوش کامیاب ہوتی تھی تو کبھی ناکامیاب ان کی اہمیت یہی ہے کہ وہ تکمیل کے متلاشی تھے اور ریاضت وجانکاہی کا خیر مقدم کرتے تھے۔

کلیات شاد کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اس میں پہلی بار اس وسیع پیمانے پر اختلاف نسخ نہیں بلکہ شاعر کی اپنے شعروں پر اصلاحوں کو، اس کی اپنے شعروں کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوششوں کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسری اہمیت اس کی یہ ہے کہ اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا گیا ہے کہ

شاعری وجدان نہیں، الہام نہیں، وحی نہیں بلکہ ذہنی کوہکنی ہے ـــــ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا:

Probably, indeed the larger part of the labour of an author in composing his work is critical labour, the labour of sifting, combining, constructing, expunging, correcting, testing.

اور یہ محنت، تنقیدی محنت تخلیقی عمل کے وقت بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی ہوتی رہتی ہے۔

اب میں ایک اور کتاب کا ذکر کروں گا اور وہ ہے "اپنی تلاش میں"۔ اس کی ابھی ایک ہی جلد شائع ہوئی ہے لیکن دوسری اور تیسری جلدیں بھی لکھی جا چکی ہیں، چوتھی اور آخری جلد ابھی باقی ہے۔ گرچہ یہ خود نوشت سوانح حیات ہیں لیکن اس کتاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میں نے تنقید کی راہ کیوں اور کیسے اختیار کی اور میری تنقید پر کون کون سے شعوری اور غیر شعوری اثرات پڑے۔ جسے میری تنقیدوں سے دلچسپی ہے اس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اس کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے میری کتابوں کو پڑھنے، شروع سے آخر تک پڑھنے اور سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا اور مجھے غالب کے لفظوں میں یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

'اپنی تلاش میں' کی جلد اول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کے واقعات ہیں۔ بعض باتوں کے ساتھ یہ البتہ ہوا ہے کہ ابتدا کرنے کے بعد میں نے انہیں تکمیل تک پہنچا دیا ہے جیسے وہ حصہ جو وہابی تحریک سے متعلق ہے یا وہ حصہ جو ساغر کی نظموں سے متعلق ہے۔ کچھ دن ہوئے میں دلی گیا تھا۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے چائے پر بلالیا اور مہمانوں میں ساغر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے آپ کا کوئی مضمون دیکھا تھا جس میں طالبعلمی کے زمانے میں آپ نے میری ۱۶ نظموں کو پسند کیا تھا اور اپنی بیاض میں نقل کر لیا تھا۔ پھر بعد میں آپ نے انہیں خارج کر دیا۔ تو میں نے بھی ان ۱۶ نظموں کو اپنے دیوان سے خارج کر دیا ہے۔

یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس جلد میں ۱۹۲۴ء تک کے واقعات ہیں۔ اسی

سال فروری میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ محمد حسن صاحب اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی ذاتی زندگی کی معمولی تفصیلات بھی یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور اگر ہیں تو بہت دب کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً ان کی شادیوں کا تذکرہ صرف اس قدر ہے کہ دو شادیاں بھی ہوئیں اور کیمبرج کا ذکر صرف اتنا ہوا یہ کہ مجھے ۱۹۳۰ء میں اسٹیٹ اسکالرشپ مل گئی اور ستمبر میں ام۔ اے کے امتحان کے بعد ہی انگلینڈ روانہ ہوگیا۔

اور وہ پھر لکھتے ہیں:

سب سے بڑی کمی یہ رہ گئی کہ کلیم الدین احمد کی ادبی رایوں کی تشکیل کا کچھ احوال اس آپ بیتی سے نہ کھلا۔ یہ مانا کہ قدیم بیاضوں سے ان کی ادبی پسند اور ناپسند کا کچھ سراغ ملتا ہے لیکن ادبی تنقید اور اقدار کا جو پورا انتظام ان کے نام سے پہچانا جاتا ہے اس کے فروغ کا حال اس آپ بیتی میں درج نہیں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ پہلی جلد میں ۱۹۲۴ء تک کے واقعات ہیں۔ جس وقت میری عمر ۱۵½ سال کی تھی۔ اس وقت میری شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے میری شادیوں کا بیان محمد حسن صاحب کیسے ۱۹۲۴ء میں ڈھونڈھتے ہیں۔ پھر کیمبرج جانے کی بات بھی ضمنی طور پر آ گئی جس نے "اپنی تلاش میں" دیکھی ہے اسے معلوم ہوگا کہ میں اپنی جنم کنڈلی میں جو پیشین گوئیاں تھیں ان کا ذکر کر رہا تھا اور اس سلسلے میں شادیوں اور کیمبرج جانے کا ذکر آ گیا۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں میں "ادبی تنقید اور اقدار کا جو پورا انتظام" میرے نام سے پہچانا جاتا ہے اس کے فروغ کا حال اس آپ بیتی میں کیسے درج کر سکتا تھا۔ شاید محمد حسن صاحب کو یہ خود احساس ہوا کہ یہ demand غلط ہے کیونکہ انہوں نے ایک جملے کا اضافہ کر دیا: ممکن ہے اس آپ بیتی کی اگلی جلد میں ان امور کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ تھی مختصر سی بازدید — میں صاف کہہ دوں کہ میں ادب میں chauvinism کا قایل نہیں۔ مقامی ذہنیت، مقامی تعصب، مقامی تنگ خیالی، مقامی غرور — ان کی ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ سیاسی دنیا میں ابھی تک H.G. wells کا one-world state کا خواب تشنۂ تعبیر ہے۔ لیکن دنیائے ادب، دنیائے تنقید ایک ہے۔ اس میں — many

goodly states and Kingdoms کی علاحدہ علاحدہ گنجائش نہیں ۔ یہ حقیقت مثل روز روشن ہے لیکن :

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

نقاد کا فرض ہے کہ وہ آفتاب سے آنکھیں ملائے، سیارہ کو سیارہ سمجھے اور چنگاریوں کو چنگاریاں سمجھے، شعلہ نہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین دل و دماغ سے میری باتوں کو مان لیتے ہیں لیکن زبان سے 'نہیں رے نہیں' کہنا اپنی ادا سمجھتے ہیں۔

••

پروفیسر کلیم الدین احمد

تاریخ پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء۔ ابتدائی تعلیم روایتی قاعدے کے مطابق ہوئی، بعد کو محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی، سابق نیو کالج پٹنہ اور پٹنہ کالج میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) (انگریزی) اور ۱۹۳۰ء میں ام۔ اے (انگریزی) کیا۔ حکومت بہار سے اسٹیٹ اسکالرشپ ملی۔ ۱۹۳۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے TRI POS (ٹرائی پوس)' اور ۱۹۳۳ء میں جدید زبانوں میں ٹرائی پوس کیا۔

اگست ۱۹۳۳ء میں پٹنہ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور جون ۱۹۳۶ء میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج کے پرنسپل مقرر کئے گئے' اور ۱۹۵۸ء میں بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن مقرر ہوئے۔ ڈائرکٹری کے دوران میں دو بار بھاگلپور یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے فرائض انجام دیئے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء سے ستمبر ۱۹۶۷ء تک بہار سکنڈری اسکول اگزامنیشن بورڈ کے اعزازی چیرمین رہے۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء کو سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء سے ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء تک بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ کے کل وقتی چیرمین رہے' اس کے بعد فروری سے اگست ۱۹۷۲ء تک خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں 'غالب اوارڈ' ملا۔ ۱۹۷۴ء سے ترقی اُردو بورڈ کے انگریزی اردو لغت پروجیکٹ کے چیف اڈیٹر ہیں اور پانچ جلدوں کے منجملہ چار مکمل کر چکے ہیں۔

تصانیف:۔ (۱) ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے مجموعۂ کلام 'گل نغمہ' کا مقدمہ ۱۹۳۹ء؛
اُردو شاعری پر ایک نظر: ۱۹۴۰ء؛ دوسرا ایڈیشن' دو جلدوں میں' پہلی جلد ۱۹۵۲ء؛ دوسری جلد ۱۹۵۶ء؛ تیسرا اڈیشن' ترمیم و اضافہ کے ساتھ' دو جلدوں میں' پہلی جلد ۱۹۶۴ء' دوسری ۱۹۶۶ء
اردو تنقید پر ایک نظر: ۱۹۴۲ء؛ دوسرا ایڈیشن (ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۹۵۷ء)؛
اردو زبان اور فن داستان گوئی: ۱۹۴۴ء؛ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء؛
تحلیل نفسی اور ادبی تنقید (انگریزی) ۱۹۴۸ء Psycho Analysis and Literary criticism؛ سخنہائے گفتنی (مجموعہ مقالات) ۱۹۵۵ء

خود نوشت : اپنی تلاش میں (جلد اول)، ۱۹۷۵ء (دوسری اور تیسری جلد زیر طبع)

تذکروں کی ترتیب : دیوان جہاں، مؤلفہ بینی نرائن ۱۹۵۹ء

دو تذکرے، تذکرۂ شورش اور تذکرۂ عشقی، ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۲ء

تذکرہ گلزار ابراہیم، مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل، دو جلدیں، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۲ء

دواوین کی ترتیب : کلیات شاد عظیم آبادی، ۳ جلدیں، ۱۹۷۵ء، ۷۷ء۱۹

دیوان جوشش عظیم آبادی ۱۹۷۷ء

رقص شرر : مسلم عظیم آبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ۱۹۷۷ء

ایک اور ترتیب : تاریخ نور (واجد علی شاہ کے خطوط، بیگمات کے نام) ۱۹۷۳ء

نظمیں (مجموعۂ کلام) : ۴۲ نظمیں : (۱۹۶۵ء)، ۲۵ نظمیں (۱۹۶۵ء)

قاضی عبدالودود پر : معاصر قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء

مقالات قاضی عبدالودود (پہلی جلد) ۱۹۷۷ء (۴ مزید جلدیں زیر طبع، بقیہ ۳ زیر ترتیب)

زیر طبع : Glassory of Literary terms

English Urdu Dictionary تین جلدیں (چوتھی، پانچویں جلدیں زیر ترتیب۔

عابد رضا بیدار

فیروز آباد کا رسالہ

ادیب

[یادش بخیر! بیس بائیس سال قبل کی بات ہے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر اعجاز احمد (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کے ساتھ ان کے وطن فیروز آباد جانا ہوا، وہاں جن ممتاز لوگوں سے بھائی صاحب رفیع الدین احمد (مصنف آنکھوں کے شہتیر) نے ملاقات کرائی ان میں اختر حسین انصاری صاحب (فیروز آباد کے معروف سوشل ورکر) اور رتن لال بنسل صاحب (ہندی کے مشہور ادیب) بھی تھے۔ انصاری صاحب کو متعارف کراتے ہوئے ان کے ساتھ ایک لاحقہ بھی لگایا گیا کہ وہ اردو کے ایک اہم رسالہ ادیب (فیروز آباد) کے مالک میر اکبر علی کے نواسے ہوتے ہیں۔ بعد میں رشتہ کی تفصیل اس طور پر سامنے آئی کہ: میر صاحب کے خسر غلام عابد صاحب تھے۔ غلام عابد صاحب کے ایک بھائی غلام حیدر صاحب تھے۔ غلام حیدر صاحب کے پوتے صفدر حسین صاحب کے فرزند اختر حسین صاحب ہیں جو اپنے نام کے ساتھ انصاری بھی لکھتے ہیں۔ انصاری صاحب کی پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی، گویا میر صاحب کی وفات کے وقت ان کی عمر ۳۱ سال کی تھی۔ ذیل میں میر اکبر علی کے جو حالات درج ہیں وہ انصاری صاحب ہی کے مہیا کیے ہوئے اس مواد پر مبنی ہیں جو میری گزارش پر رتن لال بنسل صاحب نے قلمبند کر کے بھیجا ہے اور جس کے لئے انصاری صاحب اور بنسل صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔]

(بیدار)

عظیم آباد کے محلہ سیدان کے سید علی نقی جو کسی عربی مدرسہ میں معلم تھے، ان کے تین بیٹے تھے۔ سید تقی علی، سید غلام مصطفیٰ اور سید اصغر علی۔ یہ تینوں بھائی تلاش معاش میں عظیم آباد کی سکونت ترک کر کے الہ آباد چلے آئے، جہاں سید تقی علی نے دیوانی کچہری میں وکالت شروع کر دی، غلام مصطفیٰ ان کے منشی کے طور سے کام کرنے لگے اور اصغر علی عدالت میں اہل کار ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ پورا خاندان

آگرہ چلا آیا جہاں تقی علی ہائیکورٹ میں پریکٹس کرنے لگے ۔

آگرے میں ۱۸۴۷ء کے آس پاس[1] سید غلام مصطفیٰ کے فرزند میر اکبر علی کی پیدائش ہوئی اور اسی دوران سب سے چھوٹے بھائی سید اصغر علی کے فرزند لیاقت علی پیدا ہوئے۔ ان دونوں بچوں کی ماؤں کا شیر خوارگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس لئے دونوں بچوں کی پرورش سید تقی علی کی بی بی نے کی جو خود لاولد تھیں ۔

میر اکبر علی چچا تقی علی کے یہاں پروان چڑھے۔ میر اکبر علی کی پہلی شادی چھوٹے چچا اصغر علی کی بیٹی سے ہوئی جو جلد ہی فوت ہو گئیں۔ ان کے بعد دوسری شادی سید غلام عابد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رئیس محلہ کوٹلہ، فیروز آباد، سے ہوئی۔ دو بچے ہوئے: بڑی بیٹی اصغری بیگم اور چھوٹا بیٹا امجد علی۔ بیٹے کا بچپن ہی میں نو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اصغری بیگم کی شادی چچا زاد بھائی لیاقت علی کے ساتھ ہوئی۔ اصغری بیگم لاولد تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں فیروز آباد میں وفات پائی ۔

میر اکبر علی کی سروس بک سے پتا چلتا ہے کہ ان کی تعلیم آگرہ کالج آگرہ میں ہوئی جہاں سے ۱۸۷۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا دسویں درجہ کا امتحان پاس کیا۔ بورڈ کے اس سرٹیفکٹ کے علاوہ آگرہ کالج کے اساتذہ کی جانب سے ملا ہوا ایک اور سرٹیفکٹ بھی ان کے کاغذات میں محفوظ ہے جس میں انگریزی، فارسی اور ریاضی کے اساتذہ نے ان مضامین میں میر صاحب کی ذہانت اور دلچسپی کا ذکر کیا ہے ۔

میر صاحب کی زندگی کا بہترین حصہ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمت میں گزرا۔ ۱۸۷۶ - ۱۸۷۷ء میں بورڈ آف ریوینیو، الہ آباد میں کلرک رہے۔ ۱۸۷۷ - ۱۸۷۸ء میں اجمیر میں چیف کمشنر کے دفتر میں مترجم (ٹرانسلیٹر) ہو گئے۔ ۱۸۷۹ء میں عدالت خفیفہ، اجمیر میں کلرک ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں اجمیر ہی میں تحصیلداری کے عہدہ پر تقرر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اجمیر کے چیف کمشنر کو، جس کے ساتھ یہ کام کر چکے تھے، نظام حیدر آباد کے یہاں ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا، اور وہ میر صاحب کو اپنے ساتھ لیتا گیا جہاں یہ ریزیڈنٹ کے میر منشی کے طور سے کام کرنے لگے۔ کچھ مدت بعد وزیر اعظم حیدر آباد نواب خورشید جاہ بہادر نے میر صاحب کو ریزیڈنٹ سے مانگ کر اپنا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ وہاں سے ترقی کرتے ہوئے یہ پہلے تعلقدار (یعنی کلکٹر!) ہوئے اور پھر صوبہ صاحب (یعنی کمشنر!) ہو گئے اور بالآخر حکومت نظام کے شعبۂ امور مذہبی کے ڈائرکٹر کے

---

۱ - سروس بک کے بموجب سال پیدائش ۱۸۵۴ء ہے۔ لیکن اختر حسین انصاری صاحب کو وہ خود بتایا کرتے تھے کہ زمانۂ غدر میں ان کی عمر دس سال تھی ۔

عہدے پر پہنچ گئے۔

اس کے بعد زمانۂ قیام حیدرآباد کی بقیہ کہانی قریب قریب وہی ہے، جو متعدد دوسرے 'غیرملکیوں' کے ساتھ پیش آتی رہی ہے:

"اسی زمانے میں میر اکبر علی کے مرکزی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اثر و رسوخ کو استعمال کر کے نواب سرور جنگ نے منسٹر ہو جانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ سرور جنگ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ منسٹر ہو گئے تو میر اکبر علی کو بھی منسٹر بنانے میں پوری مدد کریں گے۔ مگر اتفاق سے میر صاحب اور نواب سرور جنگ میں ناچاقی ہو گئی اور دونوں حضرات کا جھگڑا مرکزی حکومت تک پہنچ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب سرور جنگ اور میر اکبر علی کو حیدرآباد بدر ہونا پڑا۔ نواب سرور جنگ کو ان کے اثر کے تحت پنشن مل گئی مگر میر اکبر علی خالی ہاتھ حیدرآباد چھوڑ کر چلے آئے۔"

"حیدرآباد سے آنے کے بعد وہ کچھ عرصے راجہ صاحب ناپارہ کے سکریٹری رہے۔ مگر راجہ صاحب کے انتقال ہو جانے پر میر صاحب فیروزآباد چلے آئے۔"

"فیروزآباد آنے کے بعد دو موضع ہمایون پور اور کرملی کو پا خریدے۔ ساتھ ہی شہر کے اندر بھی کافی جائداد خرید لی۔ وہ فیروزآباد میونسپل بورڈ کے سکریٹری بھی رہے اور بعد میں میونسپل کمشنر بھی۔"

اختر حسین انصاری صاحب کے بیان کے مطابق میر صاحب مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف تھے:

(۱) تذکرۂ دلچسپ : راجستھان اور مدھیہ پردیش کے علاقوں کی پسماندہ اور قدیم اقوام کے رہن سہن، معتقدات اور حالات کے بارے میں۔

(۲) تذکرہ شاہ ابوالعلا اکبرآبادی۔

(۳) تذکرہ شاہ صوفی فیروزآبادی۔

رسالۂ 'ادیب' جنوری ۱۸۹۸ء سے دسمبر ۱۸۹۸ء تک جاری رہا۔ "یہ ایک سال چل کر اس وجہ سے بند ہو گیا کہ اس سال ان کے نو سالہ تنہا فرزند امجد علی کا انتقال ہو گیا تھا۔"

میر صاحب کا انتقال ۳ جون ۱۹۳۲ء کو ہوا۔ ان کی قبر اختر حسین صاحب کے خاندانی قبرستان میں ٹھیک مسجد کے سامنے تھی۔ قبر کا کوئی نشان تو باقی نہیں، مگر وہ جگہ اختر حسین انصاری صاحب کو یاد ہے۔

ادیب کے مقاصد: (۲)

پہلے شمارہ میں ادیب کی خاص پالیسی یا مقاصد کو اس طرح واضح کیا ہے:

"ماشاء اللہ یوں تو ہندوستان کا کون سا شہر اور قصبہ ایسا باقی رہا ہے، جہاں کوئی نہ کوئی اخبار یا کسی نہ کسی علم و فن کا رسالہ یا کسی نہ کسی سوسائٹی یا انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے کوئی میگزین یا جرنل شائع نہ ہوتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس عام اشاعت کے لحاظ سے ہندوستان کے قدیم حدود اربعہ کی جگہ اب یہ حدود قائم کردیں کہ اتر میں پنجابی اور پیسہ اخبار، دکھن میں مرہٹہ اور شمس الاخبار، پورب میں بنگالی اور اودھ اخبار، پچھم میں گجراتی اور راست گفتار تو شاید ہر شخص کو اس بات کی منصفی کرنی آسان ہوگی کہ ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں ہر مختلف مذہب و ملت کے ہندوستانی سیکڑوں نہیں ہزاروں طرح اسی پریس کے کام میں مصروف ہیں ... لیکن ... جہاں تک ہمارا علم ہے ان اخباروں اور رسالوں میں کوئی پرچہ ایسا (نہیں) ہے جس کی توجہ اب تک اس امر کی طرف رجوع ہوئی ہو کہ موجودہ تعلیم سے جس قدر صدمہ مذہب کو پہنچ رہا ہے اس کے انذفاع اور انسداد کی کیا تدبیر کی جائے۔ ہمارے محبانِ ملک اور اہل الرائے خاموشی اور افسوس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ انگریزی تعلیم کا کیڑا ہمارے ہرے بھرے مذہبی درخت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے اور اس وقت مسلمان اور ہندو دونوں فرقوں کے انگریزی خوانوں میں یہ تمام خیال بڑے شد و مد سے پھیلا ہوا ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر اور علماء نہ خلاقِ عالم کے قائل ہیں اور نہ کسی مذہب کے پابند۔ اس کا (نتیجہ) یہ ہے کہ ملک میں عام طور سے بے دینی روز بروز پھیلتی جاتی ہے اور الحاد و ارتداد مسلط ہوتا جاتا ہے۔ عام تعلیم یافتہ نوجوان جن کو شروع ہی سے مذہبی تعلیم کا کوئی حصہ نہیں ملا یہ سمجھ کر کہ یورپ میں بڑے دانشمند اور محقق ہیں ہم کو بھی ان کی تقلید کرنا چاہیے "مذہب کو خیرباد کہتے اور مسلمان روزہ (و نماز) اور ہندو پوجا پاٹ ترک کرتے چلے جاتے ہیں ...

ادیب کے جاری کرنے کے دیگر اغراض و مقاصد کے علاوہ سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ اس کے ذریعہ یہ ثابت کیا جائے کہ سائنس اور مذہب میں فی الاصل کوئی (خلاف) نہیں ہے ...

"یہ تو ادیب کی خاص پالیسی ہوگی۔ اس کے علاوہ دیگر مقاصد یہ ہیں:

(۱) اُردو زبان کے اعلیٰ درجہ کے لٹریچر کا مذاق پیدا کرنا اور اس وقت ہمارے ملکی تعلیم یافتوں خصوصاً نوجوانوں کے خیالات پر جو خراب اثر گندے ناولوں اور قصہ کہانیوں کی اشاعت سے پڑ رہا ہے اس کے انذفاع کی امید نیز اس امر کی کوشش کرنا کہ ادیب اُردو زبان میں وہی رتبہ حاصل کرے جو ولایت کے میگزین اور رسائل

نائن ٹینتھ سینچری، ریویو آف ریوز، چیمبرس جرنل، نیچر وغیرہ کو حاصل ہے ۔ انہیں رسایل سے چیدہ آرٹیکل بھی نہایت سلیس اور عام فہم عبارت میں وقتاً فوقتاً ترجمہ ہوا کریں گے ۔

(۲) فلسفہ، تاریخ، اخلاق، طبیعیات، تجارت، صنعت وحرفت کے متعلق اعلیٰ مضامین لکھنا۔

(۳) وقتاً فوقتاً ہر قوم اور ملک کے مشاہیر کی زندگی کے حالات شائع کرنا جس سے ہمارے ہموطنوں کو معلوم ہو کہ ہمارے اسلاف کیا تھے اور ہم کیا ہوئے جارہے ہیں ۔

(۴) مختلف ملکوں کے باشندوں کے اخلاق، عادات طرز معاشرت وغیرہ کے دلچسپ حالات طبع کرنا۔

(۵) نامور سیاحوں کے کارناموں کو اشاعت دینا اور اس کے ذریعہ ناظرین کو کبھی عرب کی مقدس سرزمین، کبھی وسط ایشیا کے سبزہ زار کوہستان کبھی افریقہ کے ریگستان اور کبھی یوروپ وامریکہ کے مشہور مقامات کی سیر کرانا ۔

اُس کے ایک حصہ میں (علاوہ) ولایت کے میگزین ورسایل کے ترجموں کے چیدہ چیدہ مضامین اردو کے خاص اخباروں اور رسالوں سے مثل اودھ اخبار، روزانہ پیسہ اخبار، اخبار عام، چودھویں صدی، حبل المتین، رھبر، نیّر اعظم، مفید عام، راجپوتانہ گزٹ، وکٹوریہ پیپر، ہندوستانی، رفیق، نسیم، مخبر دکن، معارف، مرقع عالم، الاسلام، تحفۂ حنفیہ، اصلاح وغیرہ کے منقول ہوا کریں گے ..." (ادیب کے مقاصد: بطور اداریہ) ۱/۱

مندرجہ بالا باتوں میں بعض کو خلاصتہً اور بعض کو مجملاً کہنے کے ساتھ ساتھ بعض امور کا اضافہ اس شمارہ میں شامل ایک اشتہار میں پایا گیا جو اس طرح ہے :

"مقاصد ۔ ادیب ۔ جو ہندوستان بھر میں اپنی خاص طرز کا ایک بالکل جدید علمی میگزین ہے، عمدہ کاغذ کے پچاس صفحے ہر مہینے میں ایک بار شائع ہوا کرے گا ۔ پولٹیکل معاملات سے مطلق بحث نہ کی جائے گی کیونکہ یہ اخبارات کے لئے موزوں ہیں نہ کہ علمی رسالہ کے لئے ! اس کی بڑی غرض یہ ہے کہ ملک میں اعلیٰ لٹریچر کا مذاق پیدا کیا جائے اور مغربی فلسفہ اور نیچرل سائنس کے جو حملے آج کل مذہب پر ہو رہے ہیں وقتاً فوقتاً ان کی تردید خود یورپ کے مستند عالموں اور مشہور فلاسفروں کی تصانیف واقوال سے کی جاوے، اور ناظرین کے لئے علوم وفنون تاریخی واقعات اور کارآمد معلومات کا ایک مفید اور دلچسپ ذخیرہ فراہم ہو ۔ اس کی ترتیب میں مضامین مندرجہ ذیل کا لحاظ رہے گا، گو یہ ضرور نہیں ہے کہ ایک ہی پرچے میں سب مضمون آجاویں ۔

(۱) ولایت کے روزنامے میگزین اور رسالوں کے آرٹکلوں کے ترجمے ؛ (۲) فلسفہ، اخلاق، تاریخ، طب، طبیعیات، تمدن، معاشرت، صنعت وحرفت، تجارت کے متعلق مضامین ؛ (۳) والیانِ ملک اور ہر قوم کے

مشاہیر کے تذکرے؛ (۴) دنیا کے بڑے بڑے شہروں کی عمارتوں کا ذکر؛ (۵) ناموَر سیاحوں کی سیر سیاحت اور مختلف ملکوں کے باشندوں کے رسم و رواج کے متعلق دلچسپ حالات؛ (۶) مہینے بھر کے اخباری یادگاری واقعات؛ (۷) نیچرل نظم؛ (۸) کسی مضمون پر اعلیٰ لٹریچر کا نمونہ؛ (۹) نامی اُردو اخباروں اور رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا اقتباس؛ (۱۰) کتب مفید اور تصانیف جدید پر ریویو۔

"اس رسالہ میں علاوہ اور امور کے بعض باتیں بڑی مفید و کار آمد ہوں گی۔ مثلاً ایک یہ کہ اس میں ہر مہینے کے اہم یادگاری واقعات درج ہوا کریں گے جو سال تمام کے بارہ پرچوں میں یکجا کتاب کی صورت میں فراہم ہو کر اس سال کے واقعات کی ایک مکمل تاریخ کا حکم رکھیں گے جس کے نشان و حوالہ دینے کی ضرورت ہر زمانہ میں ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے ایک حصہ میں علاوہ ولایت کے میگزین اور رسالوں کے ترجموں کے چیدہ چیدہ مضامین اُردو کے نامی اخبارات و رسائل سے منقول ہوا کریں گے۔ اس طریقے سے ہمارے ہمعصروں کے وہ منتخب مضامین جو ان کی اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت، محققانہ رائے اور پاکیزہ خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن پڑھنے کے بعد اخباروں کے ساتھ بیدردی سے ردّی کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں موضِ اتلاف سے نکل کر ادیب کے صفحوں میں جن کی سالانہ جلد بندی بآسانی ہو سکے گی، ہمیشہ کے لئے محفوظ رہیں گے۔" (اشتہار) ۱/۱

"ادیب کے مضامین میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ عبارت ایسی صاف سلیس، مغلق اور گنجلک الفاظ سے پاک اور عام فہم ہو کہ معمولی لیاقت تک کے آدمی جو اُردو میں کچھ بھی شد بد رکھتے ہوں، ہر مضمون کو آسانی سے سمجھ سکیں۔" (اشتہار) ۳/۱

لکھنے والوں کو دعوت دی گئی کہ:

"ملک کے مشہور مضامین نگار، جو مضامین ادیب کے لئے عنایت فرماویں گے وہ شکریہ کے ساتھ طبع کئے جاویں گے۔ اگر کوئی صاحب کسی خاص مضمون کے لئے نقد معاوضہ چاہیں گے وہ بھی مضمون کی حیثیت اور عمدگی کے لحاظ سے ادیب کی طرف سے پیشکش کیا جائے گا، مگر شرط یہ ہے کہ وہ مضمون کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں ان کی طرف سے شائع نہ ہوا ہو۔ معاوضہ کا تصفیہ پرائیوٹ خط و کتابت سے ہو سکتا ہے۔" (اشتہار) ۳/۱

مصنفوں اور مطبع والوں کو مژدہ دیا گیا کہ:

"ادیب کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ملک میں قابل قدر کتابوں کی اشاعت میں کامل مدد دی جائے، تاکہ بجائے گندے ناولوں اور فضول قصّے کہانیوں کے اُردو خواں پبلک میں علم، ادب، تاریخ، علوم

وفنون کی کتابوں کے مطالعہ کا عام شوق پیدا ہو۔ اس لئے جو صاحب ہم کو کسی جدید تصنیف یا تالیف سے اطلاع دیں گے ہم اس کی اشاعت میں بشرطیکہ وہ قابل قدر ہو ہر طرح سے مدد دیں گے۔ (اشتہار) ۱/۳

ادیب کے چوتھے شمارہ میں:

"... ایک اور مژدہ یہ دیا گیا: ادیب کی اشاعت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ آئندہ ششماہی سے اس سال کے لئے اس کی قیمت میں ایک روپیہ کی تخفیف کی گنجائش ان لوگوں کے لئے نکل آئی ہے، جو شروع سال سے درخواست خریداری بھیج کر پچھلے پرچے طلب فرمادیں۔ (اداریہ) ۱/۴

شمارہ ۱۲ کے اداریہ میں اڈیٹر کی کم فرصتی اور رسالہ کے بند ہونے کے آثار تھے:

ادیب کا پروگرام، بابت ۱۹۰۰ء کے عنوان کے یہ سطریں بھی تھیں:

"... مجکو بعض ضروری مشاغل کے باعث فی الحال اس قدر فرصت نہیں ہے کہ ماہوار اشاعت کا انتظام قائم رہ سکے۔ اس لئے اب یہ تجویز ہے کہ اس سال کی رواں سہ ماہی سے ادیب بطور کوارٹرلی ریویو کے پانچ جز کی ضخامت پر سہ ماہی میں ایک بار شائع کیا جاوے؛ اور اس کے دو جز میں علمی، تاریخی، اخلاقی، تمدنی، مذہبی مضامین، جدید سینٹفک تحقیقات و علمی ترقیات وغیرہ کے حالات اسی ترتیب سے شائع ہوتے رہیں گے جیسا کہ گذشتہ میں ہوتے رہے ہیں۔ باقی تین جز یعنی ۴۸ صفحوں میں ایک کتاب موسومہ مرقع صد سالہ یعنی ۱۹ ویں صدی کے تاریخی واقعات، علمی و عملی ترقیات، ایجادات و اختراعات وغیرہ کی یادگار شائع کی جاوے..." (ادیب ۱/۱۲)

یہ ادیب کا آخری شمارہ تھا۔

(۳)

ہر پرچہ کا ایک عام اندازہ کرنے کے لئے ادیب کے اولین شمارے کے مشتملات ملاحظہ ہوں:

ادیب کے مقاصد (اڈیٹر، لیکچر (ذکاء اللہ)؛ علامہ ابن خلدون (ملخص)؛ سال نو کا خیر مقدم (نہال احمد علوی حمیدی)؛ برفستان کے باشندے اور ان کی عادتیں (مترجمہ اڈیٹر)؛ عجائبات عالم؛ اشتہارات کتب و رسائل: محاربات طرائی المعروف بہ الیڈ مصنفہ ہومر ملک الشعرائے یونان مولف و مشتہر محمد باسط علی خاں ولد مولوی احمد صاحب صوفی مرحوم، مہتمم مطبع مفید عام آگرہ؛ رسالہ الاسلام الہ آباد۔ اشتہارات متعلقہ توسیع اشاعت ادیب؛ ملک کے مشہور مضامین نگار، مصنفوں اور مطبع والوں کو مژدہ، تاجروں کو اطلاع، ہمدردوں سے التماس۔

دلچسپ و مفید نکات (متعلقہ بہ علم ہیئت علم الارض، علم نباتات)؛ کارآمد معلومات؛ ایجاد و اختراع، صنعت و حرفت وغیرہ؛ متفرق علمی نوٹس وغیرہ، قیمتی باتیں؛ نصیحت کے عنوان سے ایک نظم بلا اسم شاعر؛ یادگاری واقعات؛ ریویو: ایک رسالہ **بصائر**؛ ایک کتاب **بحرالحیات**۔ ضخامت: ۴۶ ص + اول و آخر کے چار صفحات۔

اس رسالہ کا سرورق اس طور پر تھا:

ادیب

ایک بالکل نئی طرز کا ماہوار علمی میگزین

زیر ایڈیٹری سید اکبر علی اکبرآبادی

سند یافتہ کلکتہ یونیورسٹی

مطبع مفید عالم آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی چھپ کر مقام فیروزآباد ضلع آگرہ سے شائع ہوا۔

عام قیمت مع محصول ڈاک للعہ، سالانہ، ششماہی ۸؍ فی پرچہ (بشرطیکہ موجود ہو) ۸؍

ادیب کا جو درجہ اپنے معاصر ادب دوستوں اور بھائیوں کے ذہن میں تھا اس کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ مخزن کے اپریل ۱۹۱۰ء کے شمارے میں ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے الہ آباد سے جاری ہونے والے اسی نام کے رسالۂ ادیب پر جو تبصرہ کیا اس پر خود ادیب کے اڈیٹر نوبت رائے نظر نے ادیب کے مئی ۱۹۱۰ء کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ہمارے طباع دوست نے ادیب نام کی فرسودگی پر بھی توجہ فرمائی ہے اور اسے حیدرآباد کے مرحوم ادیب کا عمل تناسخ قرار دیا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ ایک پرانے اور مشہور ادیب کو بھول گئے جو سید اکبر علی صاحب کی ایڈیٹری میں غالباً فیروزآباد سے شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت خدنگ نظر نکلتا تھا اور سید صاحب نے ہمیں بھی اس کے تبادلہ میں اپنے قابل تعریف پرچے سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس کی زندگی بہت تھوڑی ہوئی مگر بارہ تیرہ سال کا عرصہ منقضی ہونے پر بھی اہل نظر اب تک اسے بھولے نہیں ہیں۔ اس طرح ہمارے ادیب پر تناسخ در تناسخ کا مسئلہ صادق آتا ہے، جو دنیا کے ہر نام اور ہر چیز میں موجود ہے۔ مجھ اس کے قبول کرنے

میں عذر نہیں کہ ادیب شجر مخزن کا ایک خوش رنگ ثمر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ مخزن قبل الذکر پرچوں کی ایک بار آور شاخ تھا۔ دنیا میں چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے ۔"

'ادیب' کی نسبت عام رائیں کے عنوان سے مندرجہ ذیل مشاہیر کی چند سطری رائیں دو سرے شمارے میں درج کی گئی ہیں :

محسن الملک، نذیر احمد، حالی، شاہ محمد اکبر ابو العلائی، عبد الرزاق صاحب البرامکہ، منشی محمد جان شوخ ظریف عظیم آبادی، شبلی۔

(۴)

ادیب کے ۱۲ پرچوں میں بہت کم ایسی چیزیں ہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکے۔ ذیل میں ہم صنف وار اس کے اہم مشتملات کا تجزیہ پیش کر رہے ہیں جو تحریریں زیادہ مفید اور کار آمد ہیں ان کے اقتباسات بھی دیے جا رہے ہیں۔ مفید اور کار آمد تحریروں کو تمام و کمال نقل کیا جا رہا ہے :

مذہبیات :

خدا کی نسبت حکمائے قدیم کے خیالات (ماخوذ از کرزن گزٹ) ۵/۱ ؛ تخلیق انسان مطابق قرآن مجید (محمد اکبر ابو العلائی) ۷/۱ ؛ ذات باری تعالیٰ کے متعلق اقوام کے ضرب الامثال ۷/۱ (ملخص از کتاب فلسفہ امثال، مولفہ مولوی ذکا ءاللہ دہلوی) چینیوں کے بعض مذہبی عقائد (ایڈیٹر) ۳/۱ "

فلسفہ مذہب : خدا ہے اور ایک ہے (سید امجد علی اشہری) ۲/۱

الروح ما الروح : اعلم (محمد اکبر ابو العلائی داناپوری) ۲/۱

— آخر میں 'لا اکبر المحجوب' کے عنوان سے اپنی ایک مسلسل غزل بھی دی ہے

قادیانی : مثیل مسیح (محمد مظہر الہادی سہیل) ۳/۱ ؛

— مخالفانہ مضمون، مرزا صاحب کے تازہ دعویٰ مثیل مسیح ہونے پر

عورتوں کا پردہ : نیچر، سائنس، مذہب استدلال : لاجواب ثبوت (سید امجد علی اشہری بچھوند، ضلع اٹاوہ) ۱۲/۱ ؛ ذیلی عنوانات : پردہ کی تعریف، ضرورت، مختلف مفہومات ؛ جمادات اور حیوانات میں پردہ ؛ سائنس، مذہب، علماء اور مجتہدین کی رائیں، سوال و جواب (پردہ کی حمایت میں مبسوط مضمون ہے)

۔ بردہ (محمد افضل الدین الطبیب) از بنگا، ضلع ہوشیار پور) ۱/۱۲ ؛ بیاہ شادی کی باتیں (آغا بیگم، نامہ نگار تہذیب نسواں، لکھنؤ)۔ بہت اچھی نسوانی زبان استعمال کی گئی ہے

سجاد حیدر، معارف، کے مضمون مطبوعہ چودھویں صدی (راولپنڈی)، مورخہ ۲۳ مئی کے جواب میں ۱/۱۰

اسلام کی کثرت ازدواجی پر یورپین فاضلوں کی رائیں، — ڈیون پورٹ، کارلایل، باسورتھ اسمتھ آئزک ٹیلر۔

ریویو کتاب - حقیقۃ الازدواج فی اباحۃ الازدواج، مصنفہ منظر الحق آزاد، تعلقہ دار سوائمہ ۱/۳

احکام الطاعون - بنگلور کے ابوالبرکات مولوی سید شاہ درویش صاحب قادری متولی مسجد جامع نے ایک استفتا کے جواب میں بحوالہ احادیث معتبرہ یہ ثابت کیا ہے کہ جان بچانے کی غرض سے طاعون زدہ شہر کو چھوڑ کر جانے کی کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ اور یہ خیال جو عوام میں پھیلا ہوا ہے کہ طاعون سے مرنے والے کو بوجہ صبر و رضا کے کامل درجہ شہادت ملتا ہے صحیح نہیں ہے۔"

فسادات پر ——— بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ بخلاف ماضی اس سال کا محرم بخیر و خوبی ختم ہوا اور اہل ہنود و اہل اسلام دونوں اس سالانہ تقریب میں اتحاد اور خلوص دلی سے شریک ہوئے اور کسی جگہ کسی قسم کا فساد نہیں ہوا۔ ان دونوں قوموں کا اتفاق ملک کے لئے نیک فال ہے۔ اللّٰھم زد فزد ۱/۵-۶

——— مدراس پریسیڈنسی کے ضلع تناولی میں دو ہندو قوموں میں فساد عظیم ہوا۔ قریب سو آدمیوں کے مارے گئے اور ایک بڑا مندر شیو کاشی کو لوٹ لیا گیا اور کئی گاؤں جلا دیے گئے۔ اب مفسدین گرفتار ہوئے جاتے ہیں اور فتنہ فرد۔ ۱/۵-۶

سائنس وغیرہ :

۔نیچر: ہوا، آگ ؛ پانی، خاک (ذکاء اللہ) ۱/۱، ۲، ۳، ۵، ۶-۷) ۳۱ صفحات پر مشتمل مبسوط عالمانہ مضمون۔

"میرا مقصود ... یہ نہیں ہے کہ نیچرل سائنس سکھاؤں بلکہ ... اردو زبان کے علم و ادب میں انشا پردازی کی ایک نئی طرز کی بنا رکھوں اور اپنے ملک کے سرمایۂ دانش کو بڑھاؤں"

ڈارون اور اس کا سلسلہ ارتقا (ایڈیٹر) ۱/۱۱ ؛ مادہ کی حقیقت (منور خان کاسگنج) ۱/۹

شہاب ثاقب : یعنی آسمانی آتشبازی (ایڈیٹر) ۱/۸" — چونکہ آئندہ ماہ نومبر کے وسط میں تاروں کی بڑی بارش ہونے والی ہے ... جس کے دیکھنے کے لئے ایک سائنٹفک مہم دائنا سے ہندوستان آئے گی ..."

علم ہیئت (ضیاء الدین احمد، ایم اے۔ البشیر) ۱/۷، مضمون نگار بعد میں علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے، اور مضمون غالباً اٹاوہ کے البشیر سے نقل ہوا۔

دلچسپ و مفید نکات: — متعلق بہ علم ہیئت: کیا آفتاب فی الذاتہ سرد ہے؛ ایک نیا سیارہ۔ — متعلق بہ علم الارض: کوہ آتش فشاں؛ — متعلق بہ علم نباتات: سونے والے درخت (مترجمہ و ملخصہ ایڈیٹر) ۱/۱؛ حیوانات باجے سے متاثر ہوتے ہیں ۱/۳؛ ہوا سے الکٹرسٹی (برقی قوت) اور اسٹیم (بھاپ) کا کام لینے کی حیرت انگیز ایجاد ۱/۴

جدید طبی تحقیقاتیں (کذا): بعض لاعلاج امراض کا علاج ۱/۷؛ — دق کا علاج؛ جذام کی دوا۔

تردید خوف ۱۸۹۹ء: دافع وہم با دلائل (بقا حسین خاں فلکی منجم اعلیٰ کانپور) — از رو ئے نجوم۔

کرۂ ارض کی ہیئت مجموعی (مرزا مہدی خاں کوکب) ۱/۱۱؛ عجائبات آفرینش: کوہ آتش فشاں (غالباً خود ایڈیٹر کے قلم سے) ۱/۱۱؛ جیالوجی علم ارض (مرزا مہدی خاں کوکب حیدرآباد) ۹/۱

عجائبات عالم: — آسٹریا میں ایک علم دوست امیر کونٹ زبیلن نے ۴۰ ہزار پونڈ خرچ کر کے ایک ایسا جہاز بنوایا ہے، جو ہوا میں مثل پرندوں کے اڑے گا... رفتار فی گھنٹہ ۲۵ میل ہوگی؛

— جاپانیوں نے زلزلہ سے محفوظ رہنے کے لئے ایک طریقہ اختیار کیا ہے، جس سے ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کب زلزلہ آئے گا۔ ایک آہنی سیخ وہ چھت پر لٹکا دیتے ہیں۔ مقناطیس کی گولی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ زمین پر تھالی ہوتی ہے، جب زلزلہ آنیوالا ہوتا ہے تو چند منٹ پیشتر گولی تھالی میں گر پڑتی ہے اور یہ لوگ فوراً اپنے اپنے مکانوں سے باہر آ جاتے ہیں؛ — پروفیسر ناگیندرا چند ناگ نے آگرہ کالج میں بے تار کے خبر رسانی کی آزمائش کی... یہ کام اسی کام کے سلسلہ میں ہے جو وہ بشرکت مسٹر اور ریلی متعلقہ محکمہ گورنمنٹ تار برقی کرتے ہیں۔ ۹/۱

• دنیا کا سب سے بڑا نقشہ؛ • دنیا میں سب سے بڑا ایل؛ • دنیا میں سب سے بڑی نہر؛
• دنیا میں توپ کے نشانہ کا سب سے زیادہ فاصلہ؛ • دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ - ۱/۱
• نینی تال کے واٹر ورکس کا افتتاح نواب لفٹننٹ گورنر بہادر نے فرمایا۔ ۱/۵-۶

ایجاد و اختراع صنعت و حرفت؛ ۱/۴

• بغیر تار کے پیام برقی بھیجنے کی جدید ایجاد کے تجربے آجکل انگلینڈ میں بڑی کامیابی کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ ایک موقع پر بڑے بڑے معزز افسر، ڈاکخانہ، تارگھر اور جہازوں کی کمپنیوں کے موجود تھے اور باوجود

مخالف ہونے موسم کے بغیر تار کے برقی پیام صحت و کامیابی کے ساتھ پہنچائے گئے۔

مفید و دلچسپ معلومات : ۸/۱ ۔ مرض فتق کا عجیب و غریب علاج : "معزز ہمعصر حبل المتین کا ایرانی نامہ نگار لکھتا ہے کہ ..." • چاند میں آبادی ؛ • جرمنی میں مصنوعی سونا تیار ہونے لگا ؛ • کرچی سے شکر نکالنے کا تجربہ کیا جا رہا ہے ؛ • آفتاب کی حرارت خانگی اور تجارتی کام میں لانے کے لئے پنڈت شری سرکرشن، بنگال نے ایک کل ایجاد کی ہے۔

سیاحت وغیرہ :

عجائبات عالم، ۱/۱ ؛ • برفستان کے باشندے اور ان کی عادتیں (مترجمہ ایڈیٹر) ۱/۱ ؛ • مسٹر سون ہیڈن کا سفر وسط ایشیا میں (محمد فضل الدین الطیب ۔ از بنگا ضلع ہوشیار پور) ۱/۱۲

تعمیرات :

• فن عمارت کے کمال و زوال کا تذکرہ (منشی معین الدین اکبر آبادی) ۱/۳، ۸

• مدینہ منورہ میں آنحضرت صلعم کے مزار مبارک پر جو جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ ان کی مالیت ۲۰ لاکھ پونڈ یعنی قریب تین کرور روپے کے شمار کی جاتی ہے۔ ۷/۱ • ڈھاکہ کے مشہور رئیس نواب سر احسن اللہ خاں نے حسینی دالان امام باڑہ ڈھاکہ کی مرمت کے لئے دو لاکھ روپے عنایت فرمائے۔ ۳/۱

وفیات :

• اس مہینہ میں انتقال ۳/۱ مولوی عبدالحق خیر آبادی ؛ مولوی عبدالرحمن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس اودے پور (صاحب تصنیف و تالیف تھے) ؛ ڈاکٹر لائیٹنر کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے بانی۔

اموات مشاہیر : ۱/۵-۶ : آنریبل نواب محمد علی خاں رشکی خلف اکبر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (م ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء) ؛ سید فضل رب عرشی غازی پوری، رحلت، بمقام حیدر آباد ؛ سوامی بیشو دھانند سرتی، (۱۸۳۳-۱۸۹۹ء) ۷/۱ (م ۶ جولائی ۱۸۹۹ء در بنارس ۔ بنارس کے مشہور و معروف فقیر) ؛ نواب سید ولایت علی خاں، بہادر رئیس اعظم، پٹنہ (بعمر ۸۳ سال) ۳ جون ؛

اِس مہینہ کی اموات : ۱/۷ ۔ ولیعہد روس ؛ سابق چیف جسٹس کلکتہ سرآویش چندر ؛ سوامی بھاشکرانند ؛ لکھنو کے وحید العصر عالم سید محمد مہدی ؛ آخری شاہ دہلی بہادر شاہ کی بیگم شاہ زمانی بیگم

وفیات ماہ ستمبر بذیل یادگاری واقعات' ۱/۸ : پنڈت اوتار کرشن آغا ؛ مالک اخبار نجم الہند مراد آباد ؛ نواب یار جنگ محمد اکرام اللہ خاں رئیس کاکوری سابق صوبہ دار گلبرگہ ؛ حاجی ہارون جعفر یوسف سیٹھ رئیس پونا ؛ دیوان بوٹا سنگھ مالک اخبار آفتاب پنجاب لاہور ؛ ۔

مختصر حالات زندگی، تھیوڈور بک مرحوم سابق پرنسپل محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ :

م ۳ ر ستمبر ۱۸۹۹ء (منقول از اودھ ریویو) ۱/۱۰

مسٹر گلیڈ اسٹون کی زندگی کے بعض دلچسپ حالات (ایڈیٹر) ۱/۲

سوانح حیات :

حضرت امام علی رضاؑ بن امام موسیٰ کاظمؑ (ابو المؤید محمد مظہر الہادی سہیل امروہوی) ۱/۵ ؛ علامہ ابن خلدون : ایک مشہور مسلمان مورخ کی دلچسپ سوانح عمری (ملخص) ۱/۱

شمرو کی بیگم کے دلچسپ حالات زندگی ۱/۱۲ — چونکہ شمرو کی بیگم کا ایک باغ اور مقبرہ وغیرہ چند عمارتیں ہمارے شہر آگرہ میں شاہ گنج کے متصل واقع ہے اور اس وجہ سے بیگم مذکور کے نام سے بچہ بچہ تک واقف ہے اور اس کی زندگی کے حالات نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں' لہٰذا ہم ان کو ... حیدر آباد کے مشہور و ممتاز اخبار مشیر دکن سے اخذ کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ وہ اخباری کالموں کے معرض اتلاف سے نکل کر ادیب کے صفحوں میں مستقل طور پر محفوظ رہیں ۔"

تعلیم و متعلقات تعلیم :

یونیورسٹی قاہرہ عرف الازھر (ایڈیٹر) ۱/۵-۶

لنگٹ سنگھ کالج مظفر پور : سنٹیفک سوسائٹی مظفر پور بنگال کی طرف سے جو اسکول اب تک جاری تھا' اس کو کالج بنانے کے لئے بابو لنگٹ سنگھ زمیندار و ٹھیکہ دار ریلوے نے ۵۰ ہزار روپیہ اور چودھری رگھو ناتھ داس زمیندار جینت پور نے ۳۰ ہزار روپیہ کی دو بڑی رقمیں چندہ میں دیں' اولوالعزمی اور قومی ہمدردی اس کو کہتے ہیں ۔ اب اسکول مذکور ماہ جون میں کالج کے مرتبہ کو پہنچ جائے گا۔" ۱/۵-۶

سوشیل ریفارم : لاہور کے کھتریوں نے ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ ایک عورت کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔ دوسری شادی کے لئے برادری سے اجازت حاصل ہونا ضروری ہے، جو اس صورت میں دی جائے گی کہ امید اولاد منقطع ہوگئی ہو اور مرد کی عمر ۴۰ سال سے زائد نہ ہو (یادگاری واقعات) ۵/۱ ؛ ـــ رائے بہادر گنگا پرشاد نے دربھنگہ کی سرائے میں ایک شفاخانہ کی تعمیر کے واسطے ۳۱ ہزار روپیہ چندہ دیا ہے ۔ گورنمنٹ نے اس فیاضی کا شکریہ ادا کیا ہے ۔ (یادگاری واقعات) ۵/۱ : **ہندی** :- مہاراجہ صاحب بیکانیر نے حکم دیا ہے کہ آئندہ سے کل دفاتر ریاست میں ناگری حروف میں کارروائی کی جاوے (یادگاری واقعات) ۵/۱ ؛ **آرٹ** : ـــ نمائش [illegible] بمبئی میں مشہور دکنی مصور راجہ روی ورما نے اعلیٰ انعام حاصل کیا ۔ (یادگاری واقعات) ۴/۱

• کرزن کا دورہ ہندوستان کے ان علاقوں کا جو طاعون و قحط زدہ ہیں ؛ • راجہ صاحب جیند کو لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اختیارات ریاست عطا کئے ؛ • مہاراجہ صاحب بھرت پور کے یہاں فرزند ارجمند تولد ہوا ؛ • مہاراجہ گوالیار نے طوفان زدگان دارجلنگ کے لئے ۵ ہزار روپیہ دیا ؛ • مہاراجہ جے پور نے قحط زدوں کی امداد کے لئے ۲۲ لاکھ دیا اور ۵۲ لاکھ تک کا وعدہ کیا ؛ • مہاراجہ بہاولپور نے لاہور چیفس کالج میں مسجد تعمیر کرنے کے لئے ۴ ہزار دیا ؛ • بابو راجیندر مارواڑی کی کوشش سے کلکتہ میں ۶۰ ہزار کا ایک فنڈ ہندو بیواؤں کے لئے قائم کیا ؛ • جگناتھ پوری میں جاتریوں کی آسائش کے لئے کلکتہ کے ایک سیٹھ کنہیالال بوگلا نے ۲۵ ہزار دیا ؛ • علاقہ مدراس کے شہر ویزگاپٹم میں سخت طوفان و باد و باراں کئی لاکھ کا نقصان ؛ • جنگ ٹرانسوال جاری ؛ • قحط و طاعون جاری ـــ (یادگاری واقعات) ۱/۱

• حاجی محمد محمود علی خاں صاحب مرحوم و مغفور، رئیس چھتاری کی وفات کے بعد نوابی کا خطاب ان کے فرزند اکبر خان بہادر محمد لطف علی خاں صاحب بہادر کو عطا ہوا ۔ (یادگاری واقعات) ۴/۱

راجپوت سبھا کا ایک بڑا مفید و کارآمد جلسہ آگرہ کالج بورڈنگ ہاؤس میں ہوا، جس کے پریسیڈنٹ ہمارے شہر کے رئیس اعظم ٹھاکر امراؤ سنگھ صاحب تھے ۔ اس جلسہ میں کثرتِ ازدواج صغر سنی کی شادی، شادیوں میں فضول خرچی اور میخواری کے انسداد کے متعلق رزولیوشن پاس ہوئے ۔ ۳/۱

مسلمان تعلیم یافتہ : ـــ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات کا نتیجہ شائع ہوگیا ۔ انٹرنس میں ہر قوم کے پاس شدہ طلبا کی مجموعی تعداد ۳۵۲۶ ہے، جن میں ۲۳۲ مسلمان ہیں ... بی ۔ اے کے ۴۳۶ پاس شدہ

طلبا میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۲۶ ہے۔ ۱/۵-۶

تصنیف و تالیف : • مہاراجہ گائیکواڑ، بڑودہ نے ایک کتاب "از قیصر تا سلطان" ولایت کے مشہور مطبع مسٹر فشر اانون کے چھاپہ خانہ میں طبع کرائی ہے؛ • مہاراجہ جے پور نے ایک نئی نہایت دلچسپ کتاب شائع کی ہے۔ یہ کتاب درباره ان زبانوں کے ہے، جو ریاست جے پور میں بولی جاتی ہیں اور جن کی تعداد ۱۵ ہے۔ اس کتاب کی صرف سو جلدیں چھپی ہیں؛ • مسٹر جسٹس امیر علی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ جس میں وہ رسم ورواج اور طرز حکومت بھی لکھا ہے۔ وہ آج کل رخصت لیکر ولایت گئے ہوئے ہیں اور وہیں اس کتاب کو ختم کریں گے؛ • ریاست جودھپور کے فاضل مصنف کویراج مراردان جی نے ایک مذہبی کتاب تصنیف کے صلہ میں فرمانروائے جودھپور سے ۵ ہزار روپیہ کی سالانہ جاگیر حاصل کی؛ • دہلی کی لٹریری سوسائٹی جس کی کاروائیاں عرصہ سے موقوف تھیں پھر جاری ہوگئی ہیں۔ پہلا لیکچر سقراط کی معذرت پر پادری رائٹ صاحب ایم اے نے دیا تھا۔ • اورینٹل کانفرنس جو امسال روما میں ہوگی اس میں شریک ہونے کے لئے حیدرآباد گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ڈیلیگیٹ مقرر ہو کر روانہ ہونگے (علمی نوٹس) ۱/۵-۶

یادگاری واقعات : • شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کو حضور نظام نے ۲۵ اشرفیاں اور دو مرصع بروش عنایت فرمائے، جن کی قیمت دو ہزار روپیہ ہے؛ • ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے سہارنپور میں منعقد ہوا۔ ۴۔۵ ہزار کے قریب چندہ جمع ہوا؛ • دہلی میں مدرسہ طبیہ کا سالانہ جلسہ ہوا۔ یہ مدرسہ ہندوستان کے مشہور طبیب حاذق الملک جناب حکیم عبدالمجید خاں صاحب کی ذاتی کوشش اور ہمت سے حل ہوا ہے۔ اس وقت ۷۰ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ (یادگاری واقعات) ۱/۳

• دہلی کے خان بہادر سید محمد ضیاء الدین خاں کو اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی آنریری ڈگری دی؛

• مہاراجہ صاحب کوچ بہار نے بابو پریسو کمار سین کلکتہ کے مشہور عالم آٹھ ہزار روپے اس غرض سے عنایت فرمائے ہیں کہ اورینٹل کانفرنس میں شریک ہوں اور انگلینڈ جاکر علوم و فلسفہ جدید تحصیل کریں؛

• ٹوکیو کی امپیریل یونیورسٹی میں بمبئی سے کرشنا جی واجے کل پوجاری نامی طالب علم پہنچ کر داخل ہوئے ہیں

• ۱۸۹۹ء کا آخری مہینہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ قومی جلسوں کی بڑی دھوم دھام رہی۔ لکھنؤ میں نیشنل کانگریس، مونگیر میں کائستھ کانفرنس، بریلی میں ویش کانفرنس، میرٹھ میں بھارگو کانفرنس اور کلکتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس ہوا!

• نواب سر احسن اللہ خان بہادر رئیس ڈھاکہ بابو جی گو بندلا کی میعاد ختم ہونے پر سپریم لیجسلیٹو کونسل ہند کے ممبر مقرر ہوئے • جدید مہاراجہ صاحب دربھنگہ نے اپنے ہر دلعزیز برادر مرحوم کی یادگار میں ۵۶ ہزار روپیہ کا چندہ خیراتی کاموں کے لئے عطا فرمایا • مہاراجہ قاسم بازار نے مسلم زنانہ اسکول کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ کا چندہ عطا کیا • کلکتہ کے ایک نامی مہاجن لالہ پورن مل نے چار لاکھ روپیہ کی وصیت مرنے کے قبل کر دی تھی۔ یہ روپیہ ایک جین کالج قائم کرنے میں صرف ہوگا • بنارس ہندو کالج کے لئے چھ لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے • اس مہینہ ہز ہائینس نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال فرمانروائے مدارالمہام حاجی عبد الجبار خان بہادر کو صلۂ حسن خدمات بجالانے پر دو ہزار روپیہ ماہوار کے ڈھائی ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر فرمایا • اس مہینہ نواب صاحب بہاولپور نے عین عالم شباب میں انتقال فرمایا • اس مہینہ میں سلطان موسیٰ علی راجہ لکادیپ کا انتقال ہوا۔ (یادگاری واقعات) ۱/۲

ندوۃ العلما لکھنؤ اور یونیورسٹی علیگڑھ (امجد علی اشہری) ۱/۳

— ہمارے اتفاق نے جو کام کئے وہ کبھی تاثیر سے خالی نہیں رہے... لیکن بعض اتفاقی نااتفاقیوں کے ہاتھوں (مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی) اس محمود عمارت کو جس نقصان کا اندیشہ ہے وہ معمولی ہچکولوں میں بھی سال گزشتہ کے زلزلہ سلہٹ و آسام سے کم نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح ہماری دوسری مقدس اور متبرک مجلس ندوۃ العلماء بعض اختلافوں سے جو مخالفت کے درجہ میں پہنچے ہیں اپنے اغراض و مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی۔

• بابو بھگوان داس ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے کر ہندو کالج بنارس کا عہدہ آنریری سکریٹری قبول کر لیا ہے۔ ۱/۵-۶؛ • ہندو کالج بنارس ۱۵ مئی کو کھولا گیا۔ ۱/۵-۶؛ • سنسکرت کالج دہلی میں ۱۵ مئی سے جاری ہوگیا۔ (یادگاری واقعات) ۱/۵-۶

علی گڑھ: — "ملک و قوم کے لئے سب سے بڑا یادگاری واقعہ تصفیہ مسئلہ تقرر سکریٹری شپ محمڈن کالج علی گڑھ ہے، جو کالج موصوف کے ٹرسٹیوں کے سالانہ جلسہ میں تاریخ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو نہایت اطمینان بخش طریقہ سے طے ہوگیا۔ اس جلسہ میں کثرت آراء سے مسٹر سید محمود کو لائف پریسیڈنٹ اور نواب محسن الملک بہادر کو سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ اختتام جلسہ پر سید محمود صاحب نے اپنی تقریر میں صدارت کو بخوشی منظور اور نواب محسن الملک کی دوامی رفاقت کا وعدہ کیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آنریبل

جسٹس امیر علی اس کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے اور آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی نے ۲ ہزار روپے سرسید میموریل فنڈ کو عطا فرمائے (یادگاری واقعات) ۱/۲؛ ـــ شیخ اصغر علی مشہور سولین پنجاب نے اپنی پوری تنخواہ ایک مہینہ کی سرسید میموریل فنڈ میں بطور چندہ کے دیدی (یادگاری واقعات) ۱/۵

• ٹھاکر درگا پرشاد سنگھ، رئیس اعظم تعلقہ دار نیل گاؤں ضلع سیتاپور۔ یہ وہی اولوالعزم رئیس ہیں، جنہوں نے نہایت سیر چشمی سے سرسید میموریل فنڈ میں ڈیڑھ ہزار روپے کا چندہ عنایت فرماکر ملک کو اس بات کا ثبوت دیدیا کہ سچی فیاضی کے لئے مذہبی یا قومی امتیاز کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱/۷

• علی گڑھ کالج میں ۲۵ تاریخ کو چیف جسٹس سر آرتھر اسٹریچی کی صدارت میں مسٹر بیک کی یادگار کے قیام کے لئے جلسہ ہوا، جس میں ۲۵ ہزار چندہ سے جمع کرنا تجویز ہوا، جس کے منافع سے کالج کا ایک طالب علم اس شرط پر تکمیل علم کے لئے انگلینڈ بھیجا جائے گا کہ وہاں سے آکر علی گڑھ کی پروفیسری قبول کرے۔ اب تک ۸ ہزار روپیہ جمع ہوا ہے۔ (یادگاری واقعات) ۱/۱۱

الہ آباد یونیورسٹی میں امتحانات ڈگری ۱۸۸۹ء سے شروع ہوئے۔ گیارہ سال کی گزشتہ مدت میں ۱۹۰ طلبا نے امتحان ایم اے پاس کیا۔ ۱۳۹۸ طلبا نے امتحان بی۔ اے پاس کیا اور ۳۳۶ نے امتحان ایل، ایل، بی۔ منجملہ اس تعداد کے ۱۸ ایم اے، ۲۷۲ بی اے اور ۱۳ ایل، ایل، بی مسلمان ہیں؛ ـــ ہمارے نئے گورنر جنرل نے مشہور پنڈت کیسری موہن گنگولی کو جو مہابھارت کے مترجم ہیں ۵۰ روپے مہینہ کی پنشن عنایت فرمائی؛ ـــ مدراس یونیورسٹی نے حال ہی میں چار عورتوں کو ایم، اے کی ڈگری دی ہے؛ ـــ مدراس پریذیڈنسی کالج کے ہونہار طالب علم مسٹر رامنی میمن کو انگلستان جانے کے قصور میں برادری سے خارج کر دیا گیا۔ راجہ صاحب کوچین نے جن کی وہ رعایا میں سے ہیں حکم دیا کہ مسٹر رامنی میمن اور اس کی زوجہ کسی مندر میں نہ جائیں اور نہ کسی کنوئیں یا تالاب کو چھوئیں۔ نیز اس کے اور اس کی بیوی کے رشتہ دار کسی مندر میں نہ جائیں، جب تک برہمن لوگ اس معاملہ میں آخری فتویٰ نہ دیں۔ ۱/۸

مشہور شاعر رڈیارڈ کپلنگ کو ۱۵ ہزار پونڈ ملتے تھے کہ آٹھ سطروں کی عبارت دستخطی خود ایک دوا کی تعریف میں لکھ دے، مگر شاعر نے انکار کر دیا۔ اسی شاعر کو لارڈ کا خطاب ملنے والا ہے (علمی نوٹس) ۱/۸

علمی نوٹس ۱/۱۰:- ـــ کپلنگ مشہور شاعر و ناولسٹ جس کو لارڈ کا خطاب ملنے والا ہے، پہلے ہندوستان میں اخبار پایونیر الہ آباد کا سب اڈیٹر تھا؛ ـــ ہندو کالج بنارس میں ولایت سے ایک اور پروفیسر بلا تنخواہ کام کرنے آئے؛ ـــ نواب بیگم صاحبہ مرشدآباد نے تعلیم نسواں کے مضامین

بر دو انعام آٹھ اور چار اشرفیوں کے مشتہر فرمائے ہیں۔ مضامین اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ میں پیش ہو کر ان کی نسبت فیصلہ ہوگا؛ ــــ خواجہ حافظ کی قبر پر کوئی قبہ نہ تھا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک دولتمند گبر نے منت مانی کہ اگر اس کی مراد پوری ہو جاوے گی، تو وہ ایک عالیشان قبہ حافظ کی قبر پر تیار کرے گا، جو ایک کھلے میدان میں ایک آہنی کٹہرے سے گھری ہوئی بالکل زمین کے ہموار ہے۔ اب اس کی آرزو پوری ہوگئی اور اس نے اپنے دعدہ کے موافق عالموں سے قبہ بنانے کی اجازت طلب کی۔ دو تین مجتہدوں نے فتویٰ دے دیا۔ اور اس نے کئی ہزار تومان کا مصالحہ وغیرہ جمع کر کے کام شروع کر دیا۔ لیکن سید علی اکبر مجتہد نے لوگوں کو بہکا کر عمارت کو خراب کر دیا۔ مگر اخبار جامع العلوم میں سید رضی حسن صاحب سیتاپوری نے اس خبر کی تردید میں ایک مضمون چھپوا دیا ہے، خدا کرے وہ صحیح ہو۔

علمی نوٹس وغیرہ ۱/۱۱ • مشہور مالک مطبع الکزنڈر میکملن ۲۵ لاکھ روپیہ نقد چھوڑ کر مرا؛ • ڈنمارک میں کوئی خاندان ایسا نہیں جس کے تمام آدمی لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں؛ • سیام کا ایک شہزادہ تحصیل علم کی غرض سے لنڈن میں وارد ہوا؛ • سول سروس کے گزشتہ امتحان میں پاس شدگان کی تعداد ۶۳ ہے، منجملہ ان کے ۷ ہندوستانی ہیں۔ اس وقت ۲۷ دیسی سول سروس میں ہیں۔ اب ان کی تعداد ۳۴ ہو جائے گی؛ • گورنمنٹ ہند نے مسٹر ٹاٹا کی مجوزہ یونیورسٹی کی سکیم منظور کر لی ہے، عنقریب کونسل میں پیش ہو کر قانون بن جائے گا؛ • چین میں اخباروں کی قیمت عموماً ایک پائی کے قریب ہوتی ہے۔

اخبارات و رسائل : ــــ (چند معزز اور نامی اخباروں کی رائیں)

ادیب کی تعریف میں منقول از دبدبۂ قیصری بریلی، معین الہند اجمیر؛ رہبر، مراد آباد

فن اخبار نویسی (ایڈیٹر) ۱/۱؛ ــ اخبار بینی کے فوائد (منور خاں) ۲/۱

بصائر ماہوار اسلامی رسالہ۔ باہتمام مولوی بقا حسین خاں فلکی منجم عالیجاہی (ریویو) ۱/۱

الاسلام، الہ آباد: یہ اسلامی رسالہ الہ آباد سے ہر انگریزی مہینہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے اس میں اسلامی خبروں کے علاوہ مشہور مورخ علامہ ابن خلدون کی معتبر تاریخ کا اردو ترجمہ اور مشاہیر عالم کی سوانح بھی بصفحہ بندی جداگانہ شائع ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب ظاہر کر کے قوم کو اسباب ترقی کی طرف متوجہ کرنا اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینا بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے

قیمت مع محصول ڈاک صرف ۱۲ سالانہ مقرر ہے۔ منشی حامد حسین صاحب مالک رسالہ سے درخواست کرنے پر خریداروں کے نام جاری ہو سکتا ہے۔ (اشتہار) ۱/۱!۔ ممالک شمال و مغرب میں ۱۱۸ اخبار درج رجسٹرڈ ہیں، جن میں ، ۷۵ ہفتہ وار اور ۴۰ ماہوار اور صرف ۲ روزانہ ہیں؛ **جلوۂ محبوب**' حیدرآباد (ماہوار گلدستہ) مہتمم و ایڈیٹر، غلام صمدانی خاں گوہر حیدرآبادی (ریویو' ۱/۵)'۔ اس کے دو نمبر موصول ہوئے ہیں۔ ایک حصہ میں دکنی اور ہندوستانی شاعروں کی غزلیں، دوسرے حصے میں لطیفے اور تیسرے حصہ میں ایک چھوڑ دو دو ناول ہیں۔ لیکن سب سے عمدہ حصہ اس رسالہ کا وہ ہے جس میں سریر آرایان سلطنت آصفیہ کا تاریخی سلسلہ شروع کیا گیا ہے؛ — **المعلومات**' جے پور ۱/۵' — اس بے نظیر علمی رسالہ کے چار نمبر لغایتہ ماہ اپریل ۱۸۹۹ء بڑی آب و تاب سے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔ فی الحقیقت ان کو تاریخی معلومات کا ایک نایاب و بیش قیمت مخزن پایا۔ مطبع مفید عام آگرہ سے چھپ کر ریاست جے پور سے شائع ہوتا ہے۔ آخر کے ۱۶ صفحوں میں ایک انگریزی ناول موسومہ عشوہ کا سلیس و شستہ ترجمہ ہوتا ہے اور شروع کے ۱۶ صفحوں میں انگلستان کے مشہور مورخ گبن کی تاریخ زوال و انتزاع سلطنت رومتہ الکبریٰ' کا بامحاورہ نہایت عمدہ ترجمہ طبع ہوتا ہے۔ اس ترجمہ میں سب سے عمدگی یہ ہے کہ مترجم نے متن تاریخ کو جا بجا محققانہ فٹ نوٹ (حواشی) سے مزین کر کے اصل کتاب کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے؛ — **شرارہ**۔ مرادآباد' شمس المطابع' باہتمام ایم فضل محمد ۱/۵' — یہ علمی رسالہ ۲۴ صفحوں پر چھپ کر مہینہ میں دوبار شائع ہوتا ہے۔ اس کے تین نمبر اس وقت دفتر ادیب میں آچکے ہیں۔ اس رسالہ میں باستثنار پولٹیکل مباحث کے معلومات عامہ کے متعلق تازہ تازہ خبریں علمی چون و چرا، پند و نصائح، لطائف، تاریخی و جغرافیائی معلومات، سوانح عمریاں، عجائبات عالم، شعر و سخن، اسلامی معلومات، صنعت و حرفت، سیر و سیاحت، اور طالب علموں کے لئے مخصوص مضامین درج ہوتے ہیں؛ — **رفیق ہند** کا دوبارہ اجراء ماہ اکتوبر سے (ایڈیٹر محرم علی چشتی) ۱/۸؛ — **گلزار ہند** (ہفتہ وار) لاہور۔ باہتمام شیخ گلزار محمد ۱/۸؛ — **پیام محبوب** (ماہنامہ گلدستہ)؛ سرپرستی نواب شمس الملک ظفر جنگ۔ باہتمام غلام حسین داد' ۱/۷؛ — **تفریح**' (ہفتہ وار) باہتمام منشی راجنداس بھارگو، مینجر اودھ ریویو ۱/۹۔ — **پبلک گزٹ** (ہفتہ وار)' پبلک پریس، امرتسر — اس سال کے جدید اخباروں میں ۱۲ اص (ریویو) ۱/۱۲؛ — **اصلاح** (المشتہر: علی حیدر، پٹنہ، محلہ گزری (اشتہار)' ۱/۱۲) — **اخبار**

لبرل (اعظم گڑھ) - مہینہ میں چار بار (اشتہار) ۱/۱۲ -

ادیب کی نسبت چند معزز اور نامی اخباروں کی رائیں، کے عنوان سے کچھ اخبارات و رسایل سے رائیں دی ہیں - اس ذیل میں مندرجہ نام ملتے ہیں: ریویو ۱/۲

- اودھ اخبار، چودھویں صدی، راجپوتانہ گزٹ، روزانہ اخبار دہلی، مفید عام آگرہ، سول اینڈ ملٹری نیوز لدھیانہ، ریاض الاخبار، انیس ہند میرٹھ، حبل المتین، کلکتہ، نیر اعظم مراد آباد، مخبر دکن مدراس، جنرل و گوھر آصفی کلکتہ، شرارہ مراد آباد -

المعلومات، جے پور ، نیرنگ جہاں، جے پور ۱/۲

یہ دونوں رسالے ماہ جنوری ۱۸۹۹ء سے جے پور سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں - شہر مذکور میں دو سوسائٹیاں ہیں، جن میں سے ایک کا نام انجمن تعلیمی اور دوسری کا نام انجمن احباب ہے - یہ دونوں رسالے انہیں دونوں سوسائٹیوں کی مساعی جمیلہ کے نتیجے ہیں -

• المعلومات ۳۲ صفحوں پر ماہوار شائع ہوتا ہے - جس کے ۱۶ صفحوں میں اماں جان کا راز نامی ایک ناول جو انگریزی ناول کا ترجمہ ہے طبع ہوتے ہیں اور دوسرے حصے میں گبن صاحب کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ ۱۶ صفحوں میں شائع ہوتا ہے -

• نیرنگ جہاں کے پہلے حصہ میں رسالہ کے اغراض و مقاصد کے علاوہ دو مضمون درج ہیں جن میں سے ایک میں تو خاندان صفاریہ کے دو نامور ہیرو یعقوب و عمر کی سوانح عمری شروع کی گئی ہے اور دوسرا مضمون عقل و مذہب کے عنوان سے محمد زکی صاحب کا لکھا ہوا ہے - یہ مضمون نہایت دلچسپ اور قابل قدر ہے - دوسرے حصہ میں اسکاٹ لینڈ کے ایک مشہور شاعر و ناولسٹ کی لیڈی آف دی لیک کا ترجمہ ہے - اس رسالہ کی ضخامت ۳۸ صفحہ ہے - المعلومات کے منیجر منشی عاشق علی صاحب اور نیرنگ جہان کے منیجر ولی محمد صاحب آزاد ہیں -

کتابیں:

کیا طبی کتابیں داخل فحش ہیں؟

- " لاہور کے بعض اخبارات سے معلوم ہوا کہ کشمیری بازار کے کتب فروشوں کی دکان سے

مجربات بوعلی سینا وغیرہ کی کچھ جلدیں پولیس نے برآمد کر کے چالان عدالت کی ہیں۔ ساتھ ہی اس کے یہ خبر بھی دیکھنے میں آئی کہ ڈاکٹر گنگادین کی ایک طبی کتاب "ینگ مینس گائڈ" کو کلکتہ ہائی کورٹ نے جائز قرار دیا اور عدالت ماتحت نے جو اس کو فحش قرار دیا تھا اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ کلکتہ ہائیکورٹ کا یہ فیصلہ نہایت اطمینان بخش ہے۔ کیونکہ طبی کتب خاص کر طبابت پیشہ لوگوں یا اس فن کے عام شایقین کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اُن کے ناظرین کی تعداد ناول کے شایقین کی طرح محدود نہیں ہوتی اور اس لئے ان کا اثر عام نہیں ہوتا۔ اگر مجربات بوعلی سینا کو جوڈیشیل نظر سے فحش قرار دیا جائے، تو انگریزی کتب اناٹمی (علم الابدان) کے ترجمے جن میں اعضاء انسانی کے ہر رگ و ریشہ کی تصاویر درج ہوتی ہیں اور جو طبی مدارس سرکاری میں پڑھائی جاتی ہیں بدرجہ اول فحش قرار دیئے جانے کی مستحق ہوں گی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس صورت میں رینالڈس کے فحش اور مخرب الاخلاق ناول اور ان کے ترجمے کھلے خزانے تین تین چار چار آنے بازاروں اور اسٹیشنوں پر بکتے پھرتے ہیں اور سرکار سے کوئی مزاحمت ان کی فروخت میں نہیں ہوتی، تو مجربات بوعلی سینا جو ایک خاص فن کی کتاب ہے کس اصول پر قابل اعتراض سمجھی جاتی ہے۔

طب یونانی اول تو ملک کی غفلت اور ناقدری سے یوں ہی نیم جان ہے، اگر اس کی یہ چند کتابیں بھی قانونی شکنجے میں پھنس کر ناقابل الاشاعت قرار پا گئیں تو فن مذکور رہا سہا بالکل نیست و نابود ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہے، جس کو روز روشن میں لانا اور اس پر متانت اور سنجیدگی سے بحث کر کے گورنمنٹ کی توجہ معطوف کرانا اخباروں کا کام ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز ہمعصر جلد اس کا نوٹس لیں گے۔ اگر اس بارہ میں ایک خاص کمیٹی سرکار سے مقرر ہو کر رائے طلب کی جاوے اور ملک کے مشہور اطبا و ادبا مثل حاذق الملک جناب حکیم عبد المجید خاں صاحب دہلوی، خان بہادر ڈاکٹر رحیم بخش صاحب لاہوری، ڈاکٹر پیارے لال صاحب سند یافتہ لندن، شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب، خان بہادر شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب وغیرہ اس کمیٹی کے ارکان مقرر کئے جاویں، تو یہ اہم مسئلہ نہایت عمدگی اور اطمینان کے ساتھ طے ہو سکتا ہے۔" (متفرقات علمی نوٹس: از ایڈیٹر) ۴/۱

گلدستۂ تمیز: مصنفہ نواب میر صدر الدین حسین خاں رئیس بڑودہ: ۲۹ مضامین انتظام امور خانہ داری اور دیگر ضروریات زندگی کے متعلق۔ اس سے پہلے مصنف چھوٹی چھوٹی کتابیں مثل گلدستۂ علوم و گلدستۂ وعظ تصنیف کر چکے ہیں۔ (ریویو) ۳/۱

کتاب فلسفۂ امثال و منتخب الامثال مؤلفہ خان بہادر ذکاء اللہ، دہلی ۳۰۴ ص (ریویو ۲/۱)

بحر الحیات : مصنفہ حکیم اصغر علی فیروز آبادی (ریویو) ۱/۱ — ازالۂ ہیبۂ وبائی پر کتاب حقیقۃ الازدواج فی اباحۃ الازواج؛ مصنفہ منظر الحق آزاد، تعلقہ دار موانمہ (ریویو) ۱/۳؛ احکام الطاعون: از ابوالبرکات مولوی سید شاہ درویش قادری (ریویو) ۱/۵؛ — ملفوظات حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی - باہتمام قاضی محمد بشیر الدین رئیس میرٹھ و حال مقام متھرا؛ — سو برس کی عیسوی و ہجری جنتری - مرتبۂ قاضی محمد بشیر الدین - ۱۸۵۱ء لغایتہ ۱۹۵۰ء - یعنی ۱۲۶۶ھ لغایتہ ۱۳۶۸ھ؛ — رسالہ معلومات السنین : عیسوی، ہجری، فارسی، فصلی، بنگلہ وغیرہ کے تاریخی حالات - مصنفہ اساس الدین احمد تسنیم نارلوی؛ — انشاء فیض منشاء، مصنفۂ احمد حسین عاقل فرید آبادی (ریویو) ۱/۷ — تجلیات عشق یعنی دیوان اکبر - مصنفۂ شاہ محمد اکبر ابو العلائی، خانقاہ داناپور (ریویو) ۱/۶ — یادگار سعدی، شاہنامۂ ہند (مصنفہ مہاراجہ پوربکشن رگھوبر جنگ بہادر، بونائش بہادر (شاہ ظفر)؛ — تاریخ دربار لاہور ۱۸۹۴ء؛ — گلشن سخن ؛ — کلید دیوناگری؛ — اسبوع شریف، حضرت غوث اعظم؛ — مرقع اسلام یا راز نہاں؛ — حرماں نصیب؛ — ناکام؛ — جنٹلمین؛ — گردش ایام؛ — گلاب کور؛ — بڑھاپے کی شادی؛ — ہنسی کی پڑیا؛ — دل بہلاؤ کا نسخہ - (اشتہار - صدائے ہند بک ایجنسی لاہور) ۱/۸؛ — امراؤ جان ادا، مصنفہ مرزا رسوا (ریویو) ۱/۸؛ — امیرانہ و غریبانہ زندگی - مصنفہ زنوفن - مترجمۂ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ حیدرآبادی (ریویو) ۱/۸؛ — برکات قیصری، مصنفۂ مولوی نہال احمد علوی حمیدی رئیس کرڑا؛ — البرامکہ مصنفۂ عبد الرزاق کانپوری، (ریویو) ۱/۹؛ — تحفۃ الاحباب، مصنفہ حاذق الملک حکیم ابو سعید محمد عبد المجید خاں دہلوی، فراش خانہ دہلی؛ اصول صحت؛ مصنفۂ ڈاکٹر کننگھم ملخصۂ خواجہ غلام الثقلین؛ — بھول بھلیاں : شکسپیر کی کامیڈی آف ایررس کا ترجمہ - از فیروز شاہ خاں رامپوری باعانت بابو سیتل پرشاد، منیجر اخبار نیر اعظم مراد آباد (ریویو) ۱/۱۰؛ — علی کی سنوار : ناشر نیر اعظم مراد آباد : عدالت دیوانی منصفی مراد آباد کے ایک فیصلے کی نقل جس میں یہ بحث بڑی دلچسپی اور تحقیق کے ساتھ کی گئی ہے کہ ایک خاص فقرہ مندرجہ اخبار رہبر، مراد آباد، داخل

نخش تھا یا نہیں، اور نخش کی تعریف کیا ہے۔ اکثر مستند اہل زبان کی شہادت بھی لی گئی ہے اور فیصلہ نہایت مدلل لکھا گیا ہے"۔ (ریویو) ۱۰/۱، — اردو رائٹر: یعنی نامہ نگار، مصنفہ راجیداس بہار گو، ایڈیٹر و پروپرائٹر اخبار تفریح لکھنؤ؛ — مطبع مفید عام آگرہ: تعریف میں محسن الملک کے دو خطوط بھی دیے ہیں۔ (ریویو) ۱۰/۱؛ — ضیاء العین: مصنفہ حکیم سید خورشید حسین لکھنوی، مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ؛ — بڑی جنتری ۱۹۰۰ء "ہمارے مخدوم منشی محمد رحمت اللہ رعد کی اعلیٰ صنعت اور شاقہ محنت و ریاضت کا نمونہ (ریویو) ۱۱/۱؛ —
انگلینڈ اینڈ انڈیا: مصنفہ راجہ بہادر لالہ بیجناتھ صاحب، طابع منشی گلاب سنگھ، لکھنؤ؛ — سفرنامۂ انگلستان: فرانس، سوئٹزرلینڈ و سیلون وغیرہ؛ — ذکر رحمانی: مصنفہ قاضی محمد ابرار احمد خاں۔ ناشر: نیر اعظم بک ایجنسی مراد آباد؛ — سوانح عمری حضرت گنج مراد آبادی؛ شمس التواریخ: مصنفہ محمد امیر الدین و اسحٰق علی۔ مطبع لامع النور، آگرہ؛ — اسلامی تاریخ (ریویو) ۱۲/۱؛ — ترجمہ تاریخ ابن خلدون (المشتہر، حامد حسین ۔ الہ آباد) (اشتہار) ۱۲/۱؛
سفرنامہ برہما؛ سفرنامہ پہاڑا: ملک نیپال کا سفرنامہ؛ پرورش اطفال؛ جوہر نباتات (المشتہر مطبع ودیا درپن میرٹھ) ۱۲/۱؛ — حسن بن صباح؛ ایام عرب: مولوی عبدالحلیم صاحب شرر ایڈیٹر دلگداز کی جدید اور بے بہا تصانیف (المشتہر محمد نثار حسین، پیام یار، لکھنؤ) ۱۲/۱؛ — جام جم: یعنی انسان کی کھوپڑی میں خواص و عادات کے بنانے اور کم و بیش کرنے کی ترکیب کا عجیب علم؛ کلید تصوف، (چھ سو صفحے کی کتاب) (المشتہر مینیجر اتم پرکاش مراد آباد) ۱۲/۱؛ — ناول: — زندہ کرامات؛ بحر در قطرہ؛ زندہ جاوید (صوفی انبا پرشاد کی تصانیف، مسمریزم اور اسپریچولزم پر)، افسوں (فرانسیسی سے یہ ناول انگریزی میں آیا۔ انگریزی سے سخاوت حسین نے ترجمہ کیا)، شرارت، خوبیٔ قسمت؛ بھول بھلیاں؛ انگشتری؛ قتیل جفا (المشتہر انیس ابن علی، نیر اعظم مراد آباد) ۱۲/۱؛ — شہنشاہ جرمن کا سفر قسطنطنیہ؛ نگار خانہ منصور (منصور حلاج کی سوانح عمری، از المرتضیٰ) (المشتہر، نیر اعظم مراد آباد) ۱۲/۱۔

ریویو کی دو مثالیں: اُردو کے دو بڑے ناولوں پر تبصرہ:

امراؤ جان ادا، مصنفہ مرزا رسوا۔

"اگرچہ ہم عام ناولوں کے اس طوفان بے تمیزی کے عموماً مخالف ہیں جو فی زمانہ برپا ہو رہا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں عام قاعدہ کے ثابت کرنے کے لئے مستثنیات لازم ہوتی ہیں اور یہ ناول بھی استثنائی فہرست میں داخل ہے۔ لہٰذا ہم اس کا ریویو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

یہ ناول جیسا کہ ٹائیٹل سے ظاہر کیا گیا ہے، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں ایک طوائف کی سوانح عمری اسی کی زبانی ہے جس میں لکھنؤ کے طرز معاشرت کی ہو بہو تصویریں، سچے واقعات اور اصلی مقامات کے بعینہٖ نقشے اعلیٰ درجہ کے ستھرے مذاق کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ مصنف کا فرضی نام (nom de plume) مرزا رُسوا ہے۔ لیکن مضامین کی بندش، الفاظ کی شستگی، خیالات کی نیچرل روانی صاف صاف پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی بڑے قادر الکلام انگریزی داں کے قلم سے نکلی ہوں۔

لائق مصنف اپنی ہیروئن کو عجب ناز و انداز اور دلفریب طریقے سے اسٹیج پر لائے ہیں، پردہ اُٹھتے ہی ناظرین کو ایک اعلیٰ درجہ کا خوشنما سین لکھنوی مشاعرہ کا نظر آتا ہے جس میں ہر مذاق کے لوگ ہیں۔ شاعروں کا کلام، ان کی خوش بیانی، ظرافت، بذلہ سنجی، نوک جھونک، طرز غزل خوانی ہر شعر پر واہ واہ غرضکہ مشاعرہ کے کل ضروری لوازمات کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ گویا تصویر کھینچ دی ہے اور فی الواقع اس مشاعرہ میں جو غزلیں پڑھی گئی ہیں ان کے بعض شعر لاجواب ہیں۔ خصوصاً آغا صاحب کی غزل میں تو اکبر آباد کے مشہور شاعر کالیخاں سفلی مرحوم کے کلام کا لطف آتا ہے۔ جن صاحبوں کو لکھنؤ کے مشاعرے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے ان کے لئے یہ سین بڑا دلچسپ ثابت ہوگا۔ اسی مشاعرے میں بی امراؤ جان تشریف لاتی ہیں، کیونکہ وہ بھی شاعرہ ہیں اور بعد اختتام حسب فرمائش مرزا رسوا صاحب اپنی سرگذشت یا سوانح عمری کہہ سناتی ہیں۔ جس کا ہر ایک سین برگ کلے کروٹن[1] کے رنگ کی طرح سرعت کے ساتھ ہر گھنٹے پر بدلتا جاتا اور نیا سماں دکھاتا ہے۔

یہ ناول محض قصہ کہانی نہیں ہے بلکہ بہ نظر غور دیکھا جاوے تو وہ نوجوانوں اور خصوصاً شہری امیرزادوں کے لئے ایک گائیڈ یا رہبر ہے، جوان کو شاہراہ زندگی کے خاروں، گڈھوں اور کھائیوں سے بچانے میں بڑی مدد دے گا اور اس فرقہ بنات الشیاطین نے جو دام تزویر ہر شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بچھا رکھا ہے اس سے محفوظ رکھے گا۔

۱۔ اس نام کا ایک انگریزی درخت ہے، جو دن میں کئی رنگ بدلتا رہتا ہے۔

مؤلف نے ناول میں جا بجا فی البدیہہ اور برجستہ اشعار بھی لکھے ہیں جن سے حسنِ زبان دوبالا ہو گیا ہے اور ایک بڑی ندرت یہ کی ہے کہ ہر مضمون کو شعر سے شروع کیا ہے جس سے آئندہ واقعات کی جھلک دکھائی دیجاتی ہے۔ الغرض اس دلچسپ و دلفریب ناول کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، جن صاحبوں کو اودھ کے دارالسلطنت کی موسائٹی کے فوٹو دیکھنے، "فیشنیبل" مقامات کی سیر کرنے اور لکھنؤ کی زبان کے چٹخارے اور مزے لینے کا شوق ہو وہ ۸/ روپیہ قیمت بھیج کر منشی مہادیو پرشاد صاحب ورما، مادرس امین آباد لکھنؤ سے طلب فرمالیں۔

بعض امور جو ہم کو مصنف صاحب کے غور کے قابل معلوم ہوتے ہیں محض دوستانہ طور پر بہ نظر نکتہ چینی ظاہر کیے جاتے ہیں۔ نواب چھبن صاحب کے ڈوبنے کے متعلق صفحہ ۱۷ پر فنِ تیراکی کا یہ نکتہ درج ہے کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا مگر اس کی خبر بہت (Remote) دور جاکر صفحہ ۱۸۳ پر ناول کے خاتمہ کے قریب نکالی ہے۔ اس سے طبیعت کو ایک غیر معمولی خلجان ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ جان کے مکان پر نواب سلطان صاحب اور اون کٹار باز خاں سے جو تکرار ہوئی اور سلطان صاحب تپنچہ مار کر تلوہ بچ گئے اس کو عقل بمشکل قبول کرتی ہے کیونکہ وہ تو غدر کے بعد ہی کا غیر ذمہ دارانہ زمانہ تھا۔ کو توال کو خوب رقمیں چیرنے کا موقع تھا۔ ایک انصاف پسند اور متجسس طبیعت چاہتی ہے کہ اس مقدمہ کی تفتیش ہوتی۔ نواب صاحب کچہری گھسیٹے جاتے کہ ذرا طوائف کے گھر جانے کا مزا ملتا۔ شہر میں شہرت اور لوگوں کو عبرت ہوتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر ایک فہرست مضامین دیدی جاتی تو ناظرین جس سبجکٹ کو دوبارہ پڑھنا چاہتے اوسکے نکالنے میں آسانی ہوتی۔ اگر فاضل مصنف صاحب مناسب جانیں تو ان امور کا طبع ثانی کے وقت لحاظ رکھیں جس کی نوبت ناول کی عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے خیال سے جلد پہنچنے کی امید۔ ایڈیٹر (ریویو) ۱/۷

فردوس بریں : مصنفہ عبد الحلیم شرر

"ہمارے مکرم دوست منشی محمد نثار حسین صاحب نثار، مالک قومی پریس و مہتمم گلدستہ پیامِ یار لکھنؤ نے وقتاً فوقتاً اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کر کے جو احسان ملک و قوم پر کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو یہ منشی صاحب کی ذات ہے، جس نے پچھلی ربع صدی میں اپنے ہر دلعزیز و مشہور گلدستہ کے دامن عاطفت میں ایشیائی شاعری کو جو لٹریچر کا جزو اعظم ہے جگہ دے کر بچالیا ہے ورنہ وہ اب تک کبھی کی ملک سے رخصت ہو جاتی اور آج اس کا کوئی نام تک بھی نہ جانتا۔ چند عرصہ سے قدیم شاعری

۲- ایک لاپروا کارکن کی بے احتیاطی سے نقل کے دوران رسالے کے یہ حصے ضائع ہو گئے

کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ التزام کیا گیا ہے کہ گلدستہ مذکور میں ایک اعلیٰ درجے کا ناول بھی شایع ہوتا ہے اور قومی پریس بک ایجنسی کے سلسلہ میں قیمتی کتابیں طبع کی جاتی ہیں۔

ناول زیر ریویو جو ہندوستان کے والٹر اسکاٹ مولانا شرر مشہور ناولسٹ کی تازہ ترین تصنیف ہے اسی سلسلے میں داخل ہے۔ فرقہ باطنیہ اسمٰعیلیہ کے تاریخی حالات اونکی مصنوعی فردوس کی دلفریب حقیقت اور بالآخر ہلاکو خاں کے ہاتھ سے اوس کے انہدام کی کیفیت بڑے دلچسپ طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ مولانا موصوف کے طبع شدہ ناول اب تک جو شہرت اور قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اس سے لگا نہیں کھاتا پلاٹ (بندش قصہ) گو ابتدا میں کسی قدر پیچیدہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی سوپر نیچرل (مافوق الفطرۃ) عالم کی سیر کر رہے ہیں اور ہرگز اس امر کا شبہ تک نہیں گزرتا کہ یہ فردوس بریں کی دلفریب و دلچسپ سبزیاں اور اس کے مرصع و زرنگار محلات وحور وقصور حقیقۃً انسانی صنعت کا نمونہ ہیں۔ لیکن باب ہشتم "افشاے راز" کے پڑھتے ہی یہ طلسم آن واحد میں ٹوٹ جاتا ہے اور خداے عزوجل نے اپنی قدرت کاملہ سے جو طاقت اشرف المخلوقات حضرت انسان کو عطا کی ہے اس کا کرشمہ نظر آجاتا ہے۔ ہم اس ناول کی تعریف کہاں تک کریں۔ اگر اس کی سب خوبیاں بیان کی جائیں تو ادیب کا پورا ایک نمبر بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ ہم صحیح کہتے ہیں کہ ہم نے جس وقت سے اس ناول کو ہاتھ میں لیا بغیر ختم کئے نہیں چھوٹا۔ جن صاحبوں کو فردوس بریں کی سیر کرنے کا شوق ہو ان کو حسین (ہیرو کا نام ہے) کی سی مالایطاق تکلیفیں اوٹھانے، شیخ الطایفہ باطنیہ شریف علی وجودی کی بیعت کرنے، امام نجم الدین نیشاپوری اور امام نصر بن احمد جیسے علماء وشیوخ وقت کو قتل ہوتے ہوئے خود دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک روپیہ خرچ کر کے منشی نثار حسین صاحب مالک قومی پریس لکھنؤ سے طلب کر لیں اور جب جی چاہے گھر بیٹھے فردوس بریں کی سیر کر لیا کریں۔ (ریویو ۱/۱۱)

نقد:-

اُردو لٹریچر: ہماری نظم ونثر (سید امجد علی اشہری) ۱/۱۱-

— ایشیائی شاعری کی اہمیت بلکہ یوروپی شاعری پر اس کی فوقیت: "ہندوستان میں نظم کے متعلق کئی گلدستے نکلے۔ اگر میری یاد میں غلطی نہیں تو سب سے پہلے جناب ریاض خیرآبادی نے گلکدہ نکالا، پھر پیام یار،

وغیرہ دس بیس گلدستے نکلے ... آخر میں ہمارے مخدوم حسان الہند مولانا شوکت میرٹھی اڈیٹر طوطی ہند نے پروانہ نام کا ایک ماہواری گلدستہ جاری کیا، جس میں بعض مضامین فاضل اڈیٹر کے قلم سے نہایت قابل قدر لکھے گئے، اور امید بھی کہ یہ بعض ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ لیکن ہمارے مخدوم کو لڑائی سے فرصت بھی تو ہو "

لٹریچر کا نمونہ : مغربی ترکیب، مشرقی مذاق، نیچرل حالتوں کا فوٹو (اشہری) ۱/۴؛ • لٹریچر: ہماری زبان : اعلیٰ کورس کے لئے (اشہری) ۱/۷؛ • نیچرل نظم : فلسفہ مذہب : اعلیٰ کورس کے لئے (اشہری) ۱/۵-۶

اُردو شاعری ـــ اور ایک فلسفیانہ اصلاحی خیال (محبوب الرحمٰن کلیم عمری اعظم گڈھی متعلم بی اے کلاس سینٹ جانس کالج آگرہ) ۱/۳

ـــ داغ کی تعریف؛ دوسرے درجہ پر امیر، جلال، تسلیم، ریاض، شوق، مضطر کے نام لئے ہیں۔ رعایت لفظی کی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ "شعر جس قدر قیود اور پابندیوں کے شکنجہ میں جکڑ جائے گا اسی قدر اظہار خیالات کا دائرہ بھی محدود ہو گا"

اِیسے :- • انسان میں ترقی کا مادہ (خادم قوم میر صدر الدین حسین بڑودوی) ۱/۷؛ افسانۂ عالم : (پادری منور خاں) ۱/۴؛ ـــ ارتقائے کائنات اور ارتقائے ذہن انسانی پر بسوط مضمون) • زمانہ کی ترقی اور ہمارا تنزل (خادم المحققین غلام رسول واحد) ۱/۸؛ • انسانی اخلاق (نہال احمد علوی حمیدی) ۱/۸؛ • انسان کی آمدورفت (محمد اکبر ابو العلائی) ۱/۱۰؛ • ریاضت : نیچر کی ڈسپنسری میں ایک مقوی دوا (سید امجد علی اشہری) ۱/۱۰؛ • گردشِ ایام (جمیل احمد جمیل : از نیر اعظم، مراد آباد) ۱/۱۱؛ • سال نو کا خیر مقدم (نہال احمد علوی حمیدی) ۱/۱

منظومات : قطعات تاریخ سالگرہ ادیب ۱۳۱۷ ہجری نبوی صلعم (ڈاکٹر شیخ محمد حسین گودادری) ۱/۱۲؛ بے ثباتی زمانہ : ع "شب کہ تھا میں عالمِ رویا میں نظارہ کناں" (بابو درگا سہائے سرور جہاں آبادی) ۱/۱۱؛ • نور جہاں کا مزار (بابو درگا سہائے سرور جہان آبادی، تلمیذ حضرت بیان دیزدانی، رئیس میرٹھ) ۱/۹؛ • نیچرل شاعر (سرور جہان آبادی تلمیذ بیان دیزدانی) ۱/۸؛ • قطعہ فارسی : در شیون نواب محمد علیخان رشکی (مولانا حالی) ۱/۶؛ • نیچرل نظم : فلسفہ مذہب اعلیٰ کورس کے لئے : (امجد علی اشہری) ۱/۵-۶

متفرقات:

صدی کب شروع ہوگی: "یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو' یا یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو اس سوال پر بحث ہو رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سن رواں کے خاتمہ پر آئندہ صدی شروع ہو جاتی ہے اور بعض کا قول ہے کہ ۱۹۰۰ء انیسویں صدی کا آخری سال ہے اور اس کے بعد بیسویں صدی شروع ہوگی اور حقیقت میں آخرالذکر حق بجانب ہیں۔ کیونکہ جب تک ایک سیکڑہ پورا نہ ہو دوسرا کس طرح محسوب ہو سکتا ہے۔ ۹۹ کے خاتمہ پر پورے سو نہیں ہو جاتے بلکہ صدی کا آخری سال پورا ہوتا ہے۔ (سول اینڈ ملٹری نیوز)" ۱/۵-۶

جنتری کے متعلق عجیب وغریب معلومات: "ہماری جنتری میں کئی باتیں واقعی عجیب ہیں۔ (۱) کوئی صدی چہارشنبہ، جمعہ اور یکشنبہ سے شروع نہیں ہو سکتی۔ یعنی کسی صدی کی پہلی تاریخ ان تینوں دنوں میں واقع نہیں ہو سکتی۔ (۲) کسی سال کی جنتری بیسویں برس پھر صحیح طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ (۳) اکتوبر کی پہلی تاریخ کو ہمیشہ وہی دن پڑے گا، جو جنوری کی پہلی کو ہوگا اور اسی طرح اپریل کی پہلی تاریخ یکم جولائی سے یکم ستمبر اور یکم دسمبر سے بلحاظ دن کے مطابق ہوگی۔ (۴) فروری' مارچ اور نومبر ہمیشہ سے ہر سال ایک ہی دن شروع ہوتے آئے ہیں۔ (۵) مئی' جون اور اگست ہمیشہ متفرق دنوں سے شروع ہوتے ہیں اور کبھی ان میں مطابقت نہیں ہو سکتی۔ (۶) ہر سال کا پہلا اور آخری دن ہمیشہ ایک ہی ہوتا رہے گا۔ یعنی اگر یکم جنوری کو دوشنبہ ہے تو ۳۱ر دسمبر کو بھی ضرور دوشنبہ ہوگا۔

نوٹ: سال کبیسہ میں ان قواعد کی پابندی ٹوٹ جاتی ہے۔"

بعض مشہور انگریزی شاعروں اور مصنفوں کے یادگار مقولے (مترجمہ ایڈیٹر) ۱/۵-۶

"شیکسپیر:- (۱) نہ قرض لو نہ قرض دو۔ (۲) غصّے کی آگ کو تحمل کے پانی سے بجھاؤ۔ (۳) جس معاملہ کے بگڑنے کا اندیشہ ہو، اوسکی درستی میں عجلت کرو۔ (۴) اپنے ہر مقصد میں ملک کی بھلائی، خدا کی اطاعت، اور حق کی تلاش مدنظر رکھو۔

"لارڈ میکالے: خوش خلقی کے معنی یہ ہیں کہ چھوٹے چھوٹے امور میں بھی مروّت برتی جائے۔

ہربرٹ:- خدا شفا بخشتا ہے اور طبیب شکریے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ڈرائیڈن: زیادہ سوچو، کم بولو۔ برک: بغیر سوچے پڑھنا ایسا ہے، جیسا کہ بغیر ہضم ہوئے کھانا۔ کوپر: کفایت شعاری فی نفسہ بڑی آمدنی ہے۔ بیکن: احتیاط سے گفتگو کرنا، فصاحت سے بہتر ہے۔ لوتھر: ماتحتوں سے بہ نسبت

ملامت کے مروت سے زیادہ کام نکلتا ہے؛ **لشپ پورٹیٹس**: بُرے خیال جلد بُرے افعال کی طرف رجوع کرتے ہیں؛ **لیبریر**: مفلس وہ ہے، جس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو؛ **ایل اسٹرینج**: ناشکری خدا اور انسان دونوں کو ناپسند ہے؛ **رکٹر**: خوشیاں ہمارے لئے مثل پروں کے ہیں اور تکلیفیں مثل بھیڑوں کے؛ **رٹربری**: نیکی کے موقع کو ہاتھ سے مت کھوؤ؛ **پٹمین**: انضباط اوقات علامت ہے ایک ضابطہ پسند طبیعت کی۔ (مترجم ایڈیٹر) ۱/۵-۶

لارڈ برلے کی دس نصیحتیں (مترجم ایڈیٹر) ۱/۵-۶

(۱) جب تم جوان ہو اپنی شادی کرنے میں نہایت احتیاط اور اندیشہ سے کام لو۔ کیونکہ اس وقت سے تمہاری آیندہ کی بھلائی اور برائی کی بنیاد پڑیگی۔ (۲) اپنی اولاد کو علم اور اطاعت سکھاؤ اور ان کی تعریف سب کے سامنے کرو اور سرزنش علیحدہ۔ ان کا کھانا اور پہننا اپنی حیثیت کے موافق درست اور ٹھیک رکھو ورنہ تمہاری زندگی تلف ہو گی۔ (۳) اپنے دوستوں اور عزیزوں کی بخوبی تواضع اور تکریم کرو اور ان کے نیک کاموں میں ان کی اعانت کرو۔ کیونکہ اس وسیلہ سے رشتۂ محبت دوچند مستحکم اور مضبوط ہو جائے گا، مگر خوشامدیوں سے پرہیز کرو ... (۶) جبتک تمہارا کوئی سخت ضرر نہ ہو کسی مفلس پر نالش نہ کرو۔ کیونکہ اس نالش سے اس کو دراصل اپنا ہمسر بنانا ہے ..

(۹) اپنی جان اور مال حتی الوسع اور کسی کے سپرد نہ کرو۔ خدا جانے وہ کب تم سے جدا ہو جائے اور پھر تم کو اس کی غلامی میں زندگی بسر کرنی ہو۔ (۱۰) گفتگو میں سخت کلامی نہ کرو۔ زبان شیریں ملک گیریں ایک مشہور ضرب المثل ہے۔ ہجو سے لوگ نفرت کرنے لگیں گے۔ ۱/۵-۶

مختلف قوموں میں مزاج پرسی کے فقرے: (مترجم ایڈیٹر)

انگریز۔ "کیسے ہو؟" **فرانسیسی**۔ "کیسی گزرتی ہے؟"۔ **جرمن**۔ کیونکر بسر ہوتی ہے؟ — **روسی**۔ "خدا تمہیں صبر عطا کرے" **ہسپانی**۔ "تمہاری عمر دراز ہو" **مصری**۔ "آپ کو پسینہ تو خوب آتا ہے"؟۔ **یونانی**۔ "خوشیاں مناتے نظر آؤ"۔ **ایرانی**۔ "تمہارا سایہ دراز ہو"۔ **عربی**۔ "تم پر سلامتی ہو" **چینی**۔ "تم نے خوب کھایا ہاضمہ تو درست ہے؟" **عبرانی**۔ "تمہارے خاندان پر امن کا سایہ ہو" **افغان**۔ "تندرستی ہو" (۱/۵-۶)

۱/۵-۶
— ۰ فن انجینری کی حیرت انگیز ایجاد: ایک پٹری کی برقی ریلوے: رفتار ۱۲۰ میل؛

• چھاپے کی ایجاد نے زمانۂ حال میں کس قدر ترقی کی ہے ۱/۵-۶ • چھاپے کے فن میں عنقریب انقلاب عظیم: گرہن نے برقی قوت سے بیسے کے حروف کے ذریعہ ٹائپ کے حروف میں ہزاروں لاکھوں کاپیاں چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے؛ • مصنوعی چاند: کولمبیا یونیورسٹی لائبریری میں، خواندگی کے لئے ایک بڑا چوبی گولا تیار کیا ہے؛ • امریکہ کے ایک قصبہ میں شہر کے چاروں طرف چار توپیں رکھی ہوئی ہیں۔ جب کبھی سخت بادل آتے ہیں تو ان میں بارود بھر کر بادلوں کو اڑا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح قصبہ کو سخت بارش سے بچایا جاتا ہے: (ماخوذ از اخبار سائنٹفک امریکن) • پیرس اور برلن کے درمیان ۵۰۰ میل سے زیادہ کے فاصلے پر، خط پہنچانے کے لئے ایک ایسی نلی تیار کرائی گئی ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں ۳۵ منٹ میں خط پہنچا دیا جاتا ہے؟

صنعت و حرفت وغیرہ: ۱/۱۱ • امریکہ کا موجد اڈیسن ایک ریل گاڑی بنانے میں معروف ہے، جو ۲۴ گھنٹے میں ۱۵۰ میل چلے گی؛ • امریکہ میں بجلی کی کلوں سے سڑکوں پر جھاڑو دینے کا رواج شروع • لالہ اچھرو مل پہلے پنجابی ہیں، جنہوں نے بمبئی سے میکنیکل انجنیر کا امتحان پاس کیا۔

مفید و دلچسپ معلومات: ۱/۱۰ • ملکہ سیام کے برابر دنیا میں کسی عورت کا پاؤں چھوٹا نہیں ہے۔ ان کا بوٹ صرف ۲½ انچ کا ہے • بمبئی کے ایک مسلمان تاجر حاجی محمد سلیمان نے بڑی فیاضی سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ اپنے قصبہ کا نل جاری کرنے کے لئے دیا۔

⑤

فیروز آباد کا یہ ماہنامہ 'ادیب' ۱۹ویں صدی کے آخری دہے میں ۱۸۹۹ء کی جنوری سے دسمبر تک ۱۲ پرچے نکال کر اردو رسائل کی تاریخ میں ایک سنگ میل چھوڑ گیا۔ اس رسالہ کی نوعیت کئی لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ افسانے سرے سے اس میں تھے ہی نہیں۔ منظومات کا حصہ (جبکہ شعر و شاعری کے بغیر ہم نوالہ نہیں توڑتے) نہ ہونے کے برابر ہے۔ انشا برائے انشا (میرزا محمد علی والی!) یا بعد کا ادب لطیف) کا اس رسالے میں کہیں نظر نہیں آتی (ایسے کے عنوان سے ہم نے جن تحریروں کو کچا مذکور کیا ہے وہ بھی مفید اور کارآمد عنوانات پر ہیں) رسالے کا جو اصل مقصد ہے اس سے کوئی شمارہ ذرا سا بھی ہٹتا نظر نہیں آیا۔ مختصر سے حجم میں زیادہ سے زیادہ علمی اور سائنسی معلومات دینے کی کوشش ہے۔ بڑا حصہ خود ایڈیٹر کے قلم سے ترجمہ یا طبع زاد ہوتا تھا جس میں سائنسی معلومات، اہم ملکی و غیر ملکی علمی اطلاعات جمع کی جاتی تھیں اور اہم کتابوں پر تفصیلی ریویو ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ سائنسی موضوعات پر مبسوط مقالے لکھے یا لکھوائے جاتے تھے۔ نیچر کے چار عناصر پر ذکاء اللہ کا مضمون 'بار ارتقائے حیات انسانی پر پادری منور خاں کا مضمون' یا علم الارض پر علم ہیئت پر مضامین! یہ سب اس پرچہ کو ایک غیر معمولی درجہ دینے کے لئے کافی تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی کم عمر پاکے بھی اپنے عہد کی ہی ایک (legend) سحر داستان بن گیا تھا!

محمد یونس خالدی
مولانا ابوالکلام آزاد میموریل اکادمی
۷- بشیشرناتھ روڈ، لکھنؤ

ابوالکلام آزاد کے خط کے بارے میں

مولانا آزاد کے گرامی نامے کے عکس کا شکریہ[۱]۔ تحریر کے متن نے یقیناً میری رہنمائی کی، یہ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبۂ ابوسلمان شاہجہان پوری کے صفحہ ۴، ۵، ۷ پر شایع ہو چکا ہے، یہ خط یقیناً مولوی عبداللطیف صاحب مالک اخبار "دارالسلطنت" کے نام ہے۔ دارالسلطنت کا اجراء ۴ مئی ۱۸۸۱ء میں ہوا تھا۔ دور ثانی کا سنہ اشاعت ۱۸۸۷ء ہے، دور ثالث کی ادارت کے لئے مولانا آزاد کو آمادہ کیا گیا، اس کی خوشخبری مولانا نے ۸ دسمبر ۱۹۰۶ء کو خواجہ حسن نظامی کو سنائی تھی (ملاحظہ فرمایئے، اتالیق خطوط نویسی مرتبہ خواجہ حسن نظامی چوتھا اڈیشن صفحہ ۵۰)، اور مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم، مالک و مدیر "وطن" لاہور کو اس مژدہ سے ۱۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو شادکام کیا تھا (دیکھئے تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر ہندوستانی اڈیشن صفحہ ۱۵۹)، یہ اخبار مولانا کی ادارت میں ضرور نکلا تھا، اس کے ثبوت میں علامہ شبلی کا وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء کو خواجہ حسن نظامی کو تحریر فرمایا تھا، جس میں لکھتے ہیں کہ:

"آزاد دارالسلطنت" میں پھنس کر نکل گئے۔ اب وکیل نے ڈورے ڈالے ہیں، غریب نازک گردن کس کس سے بچ سکتی ہے" (اتالیق خطوط نویسی صفحہ ۵۸) خط یقیناً اہم ہے۔ مولانا کی زندگی کے متعدد گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، مولانا نے ڈھاکہ کا سفر کیا تھا۔ مگر مسلم لیگ کے جلسے میں شرکت کے لئے نہیں بلکہ آل انڈیا اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ مسلم لیگ کا قیام بھی اسی موقع پر عمل میں آیا۔

●

۱- مطبوعہ جرنل ۲

تصحیح و اضافہ

دیوان حافظ

فہرست توضیحی مخطوطات فارسی جلد اول (انگریزی)، نمبر ۱۵۱ صفحہ ۲۳۱ پر دیوان حافظ کے اس شاہی نسخے کی تفصیل مذکور ہے، جس پر ہمایون اور جہانگیر کی خود نوشت تحریریں ہیں[1]۔ فہرست نگار نے ریو صفحہ ۶۲۸ کے حوالے سے حافظ کے سن وفات ۷۹۲ھ کی دلیل میں مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ پیش کیا ہے:

بسال با و ضاد و دال ابجد　　ز روز ہجرت میمون محمد

بسوی جنت اعلیٰ روان شد　　فرید عہد شمس الدین محمد

اس قطعے سے (ب + ض + د) ۸۰۶ مستخرج ہوتے ہیں۔ ریو نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ مصرع اول کو جب تک اس طرح نہ پڑھا جائے ۷۹۲ مستخرج نہیں ہوں گے: بسال با و صاد و ذال ابجد (ب + ص + ذ) مزید بر آں، بیت اول کا قافیہ محمد نہیں احمد ہونا چاہیے۔ اگلے شعر میں محمد موجود ہی ہے۔ محمد سے موزوں بھی نہیں رہتا۔

——— از افادات قاضی عبدالودود

۱۔ متن شروع ہونے سے قبل کے صفحہ پر اس نادر نسخے کو اس کتابخانہ کی نذر کیے جانے کے بارے میں ایک تحریر ہے، جو غالباً سبحان اللہ مالک نسخہ ہذا کی ہے:

"یہ دیوان حافظ کہ جس پر بعض کتبے خود جہانگیر کے ہیں کتبخانہ جناب قبلہ حضرت مرحوم مولوی حبیب اللہ خاں صاحب گورکھپور کے جس کو یہ خاکسار بطور ہدیہ اس کتبخانہ کی نذر کرتا ہے۔ آئندہ کوئی حقدار کتبخانہ حضرت مولوی صاحب، صاحب موصوف مجاز داختیار نہیں رکھتا۔ فقط ۵ جولائی ۱۹۰۶ء مطابق ۱۳ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۴ھ۔"

اس کے بعد خدا بخش خاں کی تحریر ہے، جس میں بڑے لطیف پیرائے میں سبحان اللہ خاں کا نام بھی آگیا ہے:

"وسبحان اللہ وبحمدہ۔ میں نہایت شکر گذار ہوں اوس کے نام کا جس کا نام اس وقت لوح محفوظ پر لکھا گیا۔ کتبہ خدا بخش عفی عنہ کتابدار کتابخانہ عام بانکی پور۔ تاریخ ۵ جولائی ۱۹۰۶ء۔"

ورق ۹۰ ب پر تفاؤل کے سلسلے کا ایک حاشیہ اس طرح ہے: "بمعاملۂ ماتحت بروقت بیعنامہ مولوی احمد صاحب از لسان الغیب خیر طلبی کردم و بعد نماز اشراق این بیت بر آمد، بعدۂ قصداً دای زر ثمن بوقت جسٹری کردم و توکلی را برکسے جانمودم۔ حررہ عاصی پر معاصی نعمت الحق غفرلہٗ ۲۴ شوال یوم سہ شنبہ ۱۳۱۶ھ۔ مطابق ۷ مارچ ۱۸۹۹ء"

[1] ۱۔ 'کہ' کے معنی میں

قاضی عبدالودود (بار-ایٹ-لا)

مطبوعات جدیدہ

فرہنگ آصفیہ (۳)

(۵۲) الفاظ و طرق استعمال ذیل کلیّات میر، دیوان قائم، غزلیات میر حسن و دیوان مصحفی وغیرہ آصفیہ سے غیر حاضر ہیں:

کلیّات میر جلد ۱، مرتبہ جناب ظل عباس عباسی + ۱۴۹۲ صفحے ×۱- بیخود ہونا = بیخود شدن (ر بہ چراغ ہدایت = چراغ "مجلس میں رات ایک تری پرتوے بغیر ص۱۰۵ کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بیخود تھا" ۲- ترکتازی کرنا ص۸۳۶ ۳- بزاسبابی ص۸۳۲ ۴- بجاہ ص۱۴۰ ۵- ایکوں (جمع ایک) "ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا" ص۱۳۷ + ۶- انتظارکشی ص۲۰۷ ۷- بابت گم ہونا کسی کی "دل کا نہیں ٹھکانا بابت کسی کی گم ہے" ص۱۱۰ ۸- افتداد ؍ ۹- تسلی رہنا ص۱۲۸ ۱۰- دستگاہ مسخرہ "سب خوبیاں ہیں شیخ مشیخت پناہ میں پر ایک جبہ سازی ہے اس دستگاہ میں" ص۲۱۴ + ۱۱- زن جلبی ص۲۱۱ ۱۲- بو کرنا = سونگھنا ص۱۲۴۷ ۱۳- یوسفستان ص۵۱۲ ۱۴- قسم اقسام "مستی کی دیر میں قسم اقسام کر چکے" ص۸۳۹ ۱۵- زمینی ص۱۲۹ ۱۶- عاصمہ ص۸۲۰ ۱۷- برخویش چیدہ ص۸۰۸ ۱۸- بیعانگی ؍ ۱۹- احتساب کرنا کسی پر ص۷۹۶ ۲۰- سرمشق ص۷۵۸ ۲۱- بالاچاق "قد دلکش اس کا بالاچاق ہے" ص۲۰۶ ۲۲- زورین کش ص۶۱۴ ۲۳- تخلف ص۶۰۲ ۲۴- تخفیفی (اصل میں دونوں جگہ تحقیق، غلط محض - ر بہ چراغ) "تخفیفی شملہ پیرہن و کنگھی و کلاہ" ص۷۵۲ "تخفیفی کچھ لٹپٹی باندھو ساختہ ہی ملدھماتی ہو" ص۹۲۸ ۲۵- اکلائی ص۶۱۹ ۲۶- تشتت "ساری حواسوں میں ہے تشتت جان بھی ہے گبرائی ہوئی" ص۶۷۷ ۲۷- حواسوں "تنہا نہیں - ۲۸- شنیدنی ص۶۷۹ ۲۹- بریدنی ؍ ۳۰- خمیدنی ص۶۱۰ ص۵۶۲ ۳۱- بالیدنی ص۵۲۲ ۳۲- دیدنی ص۵۰۳ ۳۳- چمنی "جامی کا تری رنگ ستمگر چمنی ہے" ص۲۸۹ ۳۴- شوائب ۳۵- عصاکش ص۲۸۲ ۳۶- چلاؤ "جب سے سمجھا کہ ہم چلاؤ ہیں ص۲۹۲ حال پرسی تک آ کر جاؤ" ۳۷- طارح ص۲۲۵ ۳۸- ڈاگ "لڑکر دتی کر تری ہاتھ کب آتی ہیں میر ص۴۷۸ یعنی ایک ایک کر سو چھریاں ہیں ڈاگ لگی" ۳۹- شیرہ خانہ (ر بہ چراغ) "قسمت تو دیکھ شیخ کو جب لہر آئی تب ص۱۱۲ دروازہ شیرہ خانے کا معمور ہو گیا"

+ ۴۰ - اندرونہ "اندرونہ کو جیسے داغ لگا" ص۳۵۲ آصفیہ میں بطور معنی - ۴۱ - اُسارا "طائر اڑتی ہوا میں
ساری اپنے اسارا جاتے ہیں" ص۶۰ ۴۲ - عجول ص۲۳۷ ۴۳ - دفات کرنا "سجدہ اس آستان کا کیا اندرو فات کی"
ص۲۷۰ میر حسن کے یہاں بھی ص ۴۴ - ناگی "گر بیکلی نے کی ہیں تکلیف ناگی" ص۲۷۱ ۴۵ - تاتی ص ۲۷۲
مزبلہ زار ص۲۳۰ ۴۶ - ہرزہ مرس "تھک کر کہیں ٹک (کذا) بیٹھ رہا ای ہرزہ مرس بس" ص۲۴۴ ۴۷ - ہرزہ چانہ
ص۶۶۹ ۴۸ - معقولگو "معقولگو ہم اتنے وہ اتنے ہرزہ چانہ" ۴۹ - عاجز سخن ص۲۰۹ ۵۰ - قادر سخن ۵۱ -
میانگیری "پیام اس گل کو پہنچا پھر نہ آئی ص۸۳۱ نہ خوش آئی میانگیری صبا کی ۵۲ - آب انسان "کہیں
نسل آدمی کی اٹھ نہ جاوے اس زمانے سے ص۲۳۵ کہ معطی (مط موتی، غلط) آب حیوان جانتے ہیں آب انساں کو"
۵۳ - مصطبہ "جہاں کے مصطبے میں مست طالع ہی نظر آئے" ص۲۲۵ ۵۴ - ہتھ بلی "گریباں شور محشر کا اڑیگا دھجیاں
ہو کر ص۲۲۳ فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ بل بے تیری ہتھ بلیاں" ۵۵ - مصیبت بیانی "کھو دیں ہیں نیند میری مصیبت
بیانیاں" ص۲۲۰ ۵۶ - سجادۂ محرابی ص۲۲۸ ۵۷ - گننا بالضم "سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز سے کہنے
کی ص۸۶ صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھی گنیگا" ۵۸ - مصلحۃً ص۸۱۶ ۵۹ - مالایطاق ص۸۱۰ ۶۰ -
جلّاب سالگ جانا ص ۶۱ - قران بوزن زبان "گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا" ص۱۵۶ ۶۲ - شور شکرہ
ص ۶۳ - شاخچہ بندی "اس گل کو لگی ہے شاخ گل کیا ص۴۹۹ یہ شاخچہ بندی چمن ہے" ۶۴ - مستہلک
"مستہلک اس کے عشق کے جانیں ہیں قدر مرگ ص۴۳۳ عیسیٰ و خضر کو ہے مزا کب وفات کا" ۶۵ - ماہول
"کس امید کا تجھ کو ای دل چاہ میں اس کی حصول ہوا ص۷۶۰ شوخ و شلایں خوشرویاں سے رہتا ہے ماہول کوئی"
ص۶۶ ۶۶ - دداغی "صبح کو آنسو نومیدانہ جیسے دداغی آتا تھا ص۷۶۲ آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہماری
رخصت ہے" ۶۷ - گوشمالی ص۸۳۰ ۶۸ - خوش سرانجام ص۵۰۶ ۶۹ - نثار کرنا "ایسا نہ ہو کہ
تم کو جوانی نثار کرے" ص۲۷ ۷۰ - مفر "یا رب یہ داد مفر اور ہم بے اختیار" ص۴۷۰ ۷۱ - پہن ہونا
کسی کا "سیر کے قابل ہے ہونا پہن میرے نام کا" ص۵۲۸ ۷۲ - ناموسدار ص۵۵۵ ۷۳ - کائی = کہ ای
"کائی سرکشاں جہاں میں کھینچا تھا ہم نے بھی سر" ص۱۳۰ ۷۴ - قران کرنا ص۲۸۸ ۷۵ - سناہٹا = سناٹا
"سناہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا" ص۱۱۲ ۷۶ - حرف نشنو ص۳۶۸ ۷۷ - بگیر آنا "گلگشت
کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے ص۲۷۲ آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے" ۷۸ - منگرا "دل کو بچا کر رکھیں تو
جائینگی عشق میں ص۴۷۰ ہر چند میر صاحب و قبلہ ہیں منگرے" ۷۹ - بدایت "اجل تو ہے دل کے مرض کی بدایت" ص۵۳۵

۸۰ - جگر کاوی ص۵۴۰ ۸۱ - خلع العذار ص۵۴۱ ۸۲ - رکن "جی کی رکن" ص۸۲ ۸۳ - بیڈھنگی "باتیں ہماری ساری بیڈھنگیاں ہیں ویسی ہی" ص۵۱۲ ۸۴ - درد کھینچنا ص۵۳۲ ۸۵ - بات نہ چیت ۸۶ - بکانا "خریداری نہیں مطلق کہاں جا کر بکاؤں میں" ص۵۵۶ ۸۷ - مسابلہ کرنا "نہ رہتے جیتے اگر ہم مسابلہ نہ کریں" ص۵۵۹ ۸۸ - دہلہ ۸۹ - گل پھول ص۵۶۳ ۹۰ - نالیدن ۹۱ - دماغ تخت ہونا "افیون ہی کی تو دلشدہ ہم روسیاہ ہیں ص۵۷۱ ہو تخت کچھ دماغ تو ہم بادشاہ ہیں" ۹۲ - نوا جھہ کرنا ص۵۷۶ ۹۲ - وقّال من مشدد ص۵۷۷ -

(۵۳) دیوان قائم (صرف غزلیں) مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام ۱-تا۸۲ آصفر × ۱ - لوک ہنسائی "رو کر کے عبث کیجیو کیوں لوک ہنسائی" ص۱۹۷ ۲ - شامہ ذمیم غیر مشدد "دوانا ہوں میں ارباب جہاں کے حسن شامہ کا" ص۲۰۴ "گل ہی وہ گلشن میں باقی ہیں نہ وہ شامے (ق) ہے" ص۲۰۲ ۳ - سارا "عنبر سارا" ص۹۶ ۴-۵-۶-۷--- افسردن، افشردن، آزردن، آوردن ص۸۴ ۸ - بردن ص۸۵ ۹ - منقش ۱۰ ۔۱۱ ڈھبنا = ڈھب پر آنا "قائم اغیار کے اغوائی بگاڑی شب بات ص۲۰۸ ورنہ کچھ کچھ تو وہ ان روزوں لگا تھا ڈھبنے" ۱۱ - ڈھبانا = ڈھب پر لگانا "لگ چلی ہی سی ہے ابھی تو خیال (کذا) ص۲۹ ڈھب چڑھیگا تو کچھ ڈھبائیگا" "یاں ڈھب تو ڈھبائی کے بہت یاد ہیں لیکن ص۱۵۵ کیا کیجے کہ اس بت کی ملاقات کڈھب ہے" ۱۲ - گنہگارہ دینا "اک نگہ کے جرم میں سو دین و دل چاہیں آپ ص۱۲۳ عشق میں دینے پڑے کیا کیا گنہگارے مجھے" ۱۳ - بیع سلم "ہے جرم ناکردہ کی (کذا) مری عفو خریدار ۲ تا گرم ہے بازار تری (کذا) بیع سلم کا" ۱۴ - امالہ "ہے الٹا ضابطہ یاں کے طبیبوں کے امالے کا" ص۳ ۱۵ - فضولی کرنا ص۸ ۱۶ - اصطلاح کرنا "نامہ بر مل رہا ہے غیر کے ساتھ ص۱۶ خط میں کچھ اصطلاح کیجیگا" ۱۷ - اشتیاقی "اگرچہ دلکش اس فرقی کی ہے شوخی و شلتاقی" ص۱۶۲ ۱۸ - بازپس دینا "یہ دل وہ جنس ہے کہ دیا گر کہیں اسے ص۱۶۹ دھڑکا بھی رہا کہ نہ دے بازپس مجھ" ۱۹ - معکوسی ص۱۷۰ ۲۰ - جیدھر = جدھر ص۱۱۷ ۲۱ - خواب "مؤنث" "خواب اک خلق پر تمام ہوئی" (ردیف) ص۱۸۳ ۲۲ - دھواں = دھواں "خوشا آتش کے جس کے گرد اس خوبی سے دھو داں ہے" ص۱۸۷ ۲۳ - راڑ (مؤنث) "سوتی ہوئی یہ راڑ تو ناحق کو جگائی" ص۱۹۷ ۲۴ - سوتی ص۱۷۹ ۲۵ - شیب ۲۶ - قلّاب ص۹۸ ۲۷ - خوابندہ ص۴۲ ۲۸ - زجاج ص۹۷ ۲۹ - خواب کرنا ص۹۸ ۳۰ - خلاقت ص۱۱۵ ۳۱ - خونچہ ص۱۳۳ ۳۲ - طیب "اڑتی پھریں ہیں طیب کی لپٹیں ہوا کے ساتھ" ص۱۴۰ ۳۳ - ریو ورنگ ص۱۴۱ ۳۴ - دکھ دہی ص۱۵۱ ۳۵ - خوش نیتی ص۱۵۲

٣٦-شنگی ص ١٥٧ ٣٧-صندوق فرنگی ص ١٥٨ ٣٨-طوسی ص ١٧٨ ٣٩-طوفان طراز ص ١٨٢ ٤٠-مجوسی ص ٢٦١ ٤١- داد لیست ص ١١٠
٤٢-غلو کرنا "چھیڑی جو ٹک نسیم مجھے سو غلو کردں" ص ١٠٨ ٤٣-رہگذری "جس دشت خطرناک کا میں رہگذری ہوں" ص ١٠٣
٤٤-شرف اندوز ص ١٠٣ ٤٥-خود آرا ص ٩٦ ٤٦-سوختن ص ٦٢ ٤٧-مصادم ص ٥٩ ٤٨-ترٹھن ص ٥٦ ٤٩-آمے
(= ہاں) ص ٥٥ ٥٠- اٹالا "اک ترے غم ہی کا اس گھر سے اٹالا نہ گیا" ص ٦ ٥١- ادب دینا، کسی کو "آداب ناز
جن نے سکھائے تمہیں ہیں شوخ ص ١٣٣ مقدور ہو تو دیجے ادب اس ادیب کو" ٥٢- ادیب " ٥٣- اکاس (= اکاش)
٥٤- ایچنا "آج قائم تجھے آ لگی نہ جانے کب خواب ص ٤٠ رو کے کھنچتا ہے تو جس دم تو ایچے ہے آب" ٥٥- ادھر ص ٢ (بطور اسم) آصف مرف بطور
صفت" فلک نے چھینڈ کو منزل دی مجھ دوانی کی ص ٥٥، کی باری فکر اس ادھر کر بھی بسانے کی" ٥٦- بد شرابی کرنا "نہ جانے کس کی
چشم مست نے یہ بد شرابی کی" ص ٢٠٦ ٥٧- بد گوہری۔ "بد گوہری گردوں کی کیا تجھ سے بیاں کیجے ص ١٤٠" ٥٨- برّاقی "سیاہی
میں مسی کی ہے جو ان دانتوں کی برّاقی" ص ١٦١ ٥٩- بسمل (= قتل کرنا) "ہم نہ شائستہ بسمل نہ سزاوار قفس" ص ٦٩
٦٠-بلد "راہ نہ دیدہ کو بلد چاہیئے" ص ١٤٣ ٦١- پراچہ "پھوٹیں اے مدعی یہ دیدہ گریاں میرے ص ١٤٤ ہر گلی کوچے ہے
بستی کا پراچہ کی دکاں" ٦٢- تاؤ بھاؤ "ناچے ہے شیخ وجد میں کس تاؤ بھاؤ سے" ص ٢٦ ٦٣- تغیر (بروزن طریق)
"دی تو تغیر حال اب کے یہی ص ٦٥ کام اپنا تو تھا تغیر لباس" ٦٤- تقید کرنا، کسی پر "پر تقید میں چشم پر نہ کیا" ص
٦٥- توف (= تف) ص ١٣٥- ٦٦- تیں (= تم) ص ١١٦ ٦٧- ٹال (ٹالنا سے حاصل مصدر) ص ١٩٦ ٦٨-
ٹھر کر بیٹھنا "ماری جا نے کر ٹھری بیٹھی ہیں" ص ٩٩ ٦٩- جیب (= زبان) ص ١٣٣ ٧٠- چڑچڑا ص ٢٠٧
٧١- چھٹ "عشق چھٹ ہر درد کے قائم ہزاروں ہیں علاج" ص ١٢١ ٧٢- چاؤ کرنا، کسی امر کا "یار جس نوح
کے طوفان کا کرتے ہیں چاؤ" ص ١٤٥ ٧٣- چھڑکاؤ ص ٦ ٧٤- خراش (مذکر) "جاتی جاتی جائیگا ہر دیہ سینے
کا خراش" ص ٦٦ ٧٥- رمانا "جو پوچھے کوئی دنیا کا حال مجھ سے تو پوچھ ص ١٩٢ کہ ایک عمر میں یہ فاحشہ رمائی ہے"
٧٦- زیاد (= زیادہ) ص ١٠٥ ٧٧- سنکوانا "جل بجھا دل جب تلک ہم جی کو سنکوا تے رہے" ص ١٦٦ ٧٨- غولدنگی "یہ سفلہ
پیش لے جاتا ہے اپنی غولدنگی سے" ص ١٥٧ ٧٩- فارق "فارق نیک و بد دہر ہے تیرا انپدار" ص ٩٨ ٨٠- کڈھنگ
"خدا کرے کہ یہ ڈھنگ اس کڈھنگ سے چھوڑے" ص ١٤١ ٨١- لپ جھپ "رہیو ہشیار تو لپ جھپ سے بتاں کی قائم" ص ١٣٠
٨٢- ہنیا دینا "کیا ہتیا تجھے یہیں دینی ہے اے عزیز ص ١١٠ اتنا پڑا ہے ملک — خدا جا کر
مر کہیں"

(٥٤) کلیات قائم ٢، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا احسن ١ تا ١٢٥ آصفر × ١- بنیدق عید ص ٦
٢- سپس خیز ص ١٨ ٣- حلوا خاتو (بدون ن) ص ١٨ ٤- تکھونٹ "داڑھی بھی جو نکلی تو تکھونٹ نکلی" ص ٢٤ ٥- کھیم کھانچا

۶- نیرّین ص۴۳ ۷- سوءمزاجی ص۲۹ ۸- اکاس بالف مقصورہ ص۴۲ ۹- منظلہ ص۵۷ ۱۰- لخر لخر کرنا مفتی پھرتے ہیں بھوک سے کرتی لخر لخر" ص۶۳ ۱۱- گوار" وادی اس زیست پر اس دکھ میں جو ہو دیگی گوار" ص۷۴ ۱۲- شکل پذیر ص۹۳ ۱۳- نقیر و قمطیر ص۹۵ ۱۴- شناۃ ص۹۶ ۱۵- وادیلاہ ص۹۷ ۱۶- دیباہ ص۹۸ ۱۷- ملائکوں (جمع الجمع ملک) ص۱۰۲ ۱۸- ذرخیم ص۱۲۵ ۱۹- جھونٹ تی اونٹ ص۱۵۳ ۲۰- اوستاد ۲۱- بین کاری "کہ تھی بین کاری میں وہ اوستاد" ص ۲۲- بلشت = بالشت ص۱۶۶ ۲۳- مصالحہ ص۱۷۴ ۲۴- اہون ص۱۹۳ ۲۵- خبازہ ص۱۹۶ ۲۶- زلزال ص۲۰۰ ۲۷- خذلان ص۲۴۳ ۲۸- زفت "چہرۂ زفت" ص۴۰ ۲۹- بھڑنگ "بھڑووں میں ہے جہاں کے تو بھڑوا بڑا بھڑنگ" ص۵۷ ۳۰- بادشاہی تی گدائی ص۸ ۳۱- خرسک ص۶۷ ۳۲- انند کرنا ص۳۰ ۳۳- اُتہات ص۱ ۳۴- بہارانہ ص۲۹۳ ۳۵- استعجال ص ۳۶- اموال ص۲۵۴ ۳۷- آزادہ طور ص۱۴۰ ۳۸- غمام ص۹۷ ۳۹- اغنام ص۸۰ ۴۰- جانکوب ص۳۱۷ ۴۱- زقوم ص۱۰۳ ۴۲- ڈھنڈوانا ص۱۳ ۴۳- اقتران "اقتران نجوم" ص۱۰۵ ۴۴- چکچوندھ ص۳۰۴ ۴۵- ڈانٹ دینا" خوشی سے دہن کو دیجیو اب ڈانٹ" ص۲۱۰

(۵۵) غزلیات میر حسن، مرتبہ ڈاکٹر ذکی الحق ۱/۱۰۰ تا ۵۰ آصفی ×

۱- حلال" حلال خلق کی ہے وہی مشکلات کا ص۵ دو جگ میں آسرا ہے محمدؐ کی ذات کا" ۲- خلّص "جلوے سے ہے بنی ہی کہ ساری یہ کائنات ص۶ خُلّص وہی ہے دونوں جہاں میں تمام" ۳- بود و باش مذکر" وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا" ص۷ یہ شعر کا مصرع اہے، اور "اپنا" ردیف یا قافیہ نہیں، یہ ناممکن نہیں کہ دراصل 'اپنی' ہو، مگر کلیات میر حسن کے چار یا پانچ نسخے جو میں نے دیکھے ہیں، ان میں 'اپنا' ہی ہے، اور ڈاکٹر ذکی الحق کو بھی کسی نسخے میں جو ان کی نظر سے گزرا ہے (اور انہوں نے کم و بیش ۲۰ نسخے دیکھے ہیں) 'اپنی' نہیں ملا۔ اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ میر حسن نے 'اپنا' ہی لکھا تھا۔ ۴- آفات کرنا کسی پر ص۲۶۵ ۵- اشتہار پانا کسی کا" پا دے جہاں میں میرا نا اشتہار رونا" ص۹ ۶- ذکر اور اذکار" نہ لا پھر پھر کے تو کچھ ذکر اور اذکار رونے کا" ۷- ڈھانا "کعبہ سمجھ کے میرے اس دل کے گھر کو ڈھانا" ص۱۴ ۸- افغاں = فغاں ص۲۱ ۹- اجانا" ہوش میں نہیں جب سے سنا ہے اس کو ص۲۹ پھر ٹک اجا ہوا اس کو وہ ترانہ کیا تھا" ۱۰- جلباب ص۳۸ ۱۱- ڈھیرا تی چھیرا" کوئی لنگڑا کوئی لولا کوئی کانا کوئی ڈھیرا" ص۴۰ ۱۲- خانہ جنگی کرنا ص۴۸ آصفی میں خانہ جنگی ہے ۱۳- چشمک زن ص۴۸ ۱۴- چھپر بند (بدون تشدید) " مرے رونے سے عاجز ہیں چھپر بند" ص۵۶ ۱۵- رت = رتھ "نکلیں سیر کو سب چھوڑ بہو رتوں پہ" ص۵۹

۱۶- دار و مدار کرنا " لگیا دل کو ہنستی ہنستی صنم ص۶۹ کر کر دار و مدار اور اخلاص " ۱۷- رلغ " باغ و راغ ہے "
۱۸- کنارہ کھینچنا کسی سے ص۹۶ ۲۱- حلوہ (غلط لفظ) " حلوۂ بیدود " ص۹۷ ۲۲- جدّ و کد ص۱۱۵ ۲۳-
ٹھونک بجا کر لینا ص۱۱۶ ۲۴- زبونی ص۱۱۶ ۲۵- حرکاتیں جمع الجمع حرکت " کھب رہی ہیں وہ تری سب حرکاتیں دل میں "
ص۱۴۲ ۲۶- جلّ جلالہٗ ص۱۲۹ ۲۷- اور نہیں تو " ہر بات میں اس سے جو سُنا اور نہیں تو ص۱۳۰ ہم کو بھی یہی درد
ہوا اور نہیں تو " " اک بات تو سُن جاؤ بھلا اور نہیں تو " ۲۸- رائی دہائی " اگر چاروں طرف تیری ہی اک
رائی دہائی ہو " ص۱۳۲ ۲۹- حرّافی ص۱۳۹ ۳۰- جھوٹھ ایک غزل کی ردیف ص۱۴۱ اس کے ساتھ دوسری ہائیہ غزلیں-
۳۱- حرف و حکایات کے لیے فعل واحد ص۱۶۷ ۳۲- اشارات کے لیے فعل واحد، مونث ۳۳- آفات مثل اشارات
ہر دو ص۲۱۰ ۳۴- چقماقی " رکھی ہے کون یہ بندوق چقماقی تکلف ہے " ص۲۵۵ ۳۵- ۳۶- الیمانی، انگریزی = انگریزی
" یا الیمانی ہے یہ تلوار یا انگریزی ہے " ۳۷- خلاقی ص۲۵۴ ۳۸- چاؤ چوز " دو دن کے چاؤ چوز حسن کے بھی ہو رہے ص۲۴۱
یہ پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آرہے " ۳۹- لب مونث خواب میں شب جو تری لب کاٹی " ردیف - مذکر بھی ص ۴۰-
حلاق ص۲۵۴ ۴۱- اغراقی " سخن جو بے تکلف ہوئی تو وہ جی کو لگتا ہے ص۲۵۵ نہیں تو کیا بندھو گر بات اغراقی تکلف سے "
۴۲- انگیز " گالیاں ہیں صاف داں اور یاں بڑی انگیز ہے " ص۱۹۷ ۴۳- دار السلام ص۶ ۴۴- منھ بھیرا
" کبھی زلفوں سے ہے اس کی کبھی گیسو سے منھ بھیرا " ص۴۰ ۴۵- افسوس کھانا ص۸ ۴۶- ادھ بیچ " بلبل کا جی
نکل کے بھی پہنچا نہ گل تلک ص۲۵۱ ادھ بیچ سے صبا کے آپ ہی اڑا گئی " ۴۷- ادل میں لینا " چھوڑیں نہ جی کو جب
تک دل لیں نہ ادل بٹے " ص۲۴۶ ۴۸- انگار ص۲۴۳ ۴۹- پہاڑیا " لاتے ہیں شہد و مشک کو اکثر پہاڑیے " ص۲۳۹
۵۰- نشروع (ع تلفظ میں نہیں) ص۲۳۸

(۵۶) تذکرۂ میر حسن طبع ۲، انا ۲۶ آصفر × ۱- دھمکا دُنا " شمشیر اللہ سپر سے دھمکا دُتے ہیں
ہم کو - یہ بھی سپاہیوں کی یار و ادائیاں ہیں " میر محمد حسین، کلیم ۲- ادائیاں جمع ادائی " ۳- خبر عطر " باد صبا
سے زلف معطر کی ہم تلک - مدت ہوئی کہ پہنچی نہیں کچھ خبر عطر " سجاد ۴- نسترنا " الیسا مرید کیوں نہ دو عالم میں نسترے
پیروں کی راہ میں جو کرور وں دیا کرے " اشتیاق، ولی اللہ ۵- تماکو = تنباکو " تماکو کو نہ جانوں کیا سبب ہے "
جعفر علی خاں (ذکی) ۶- مشعلچن (ع تلفظ میں نہیں آیا)، تو خصم گن کے مشعلچن ذکی ہے " کمترین
۷- نفرانی " پلا کر مست نفرانی کو تاڑی "

(۵۷) دیوان مصحفی ۱ (علمی مجلس دہلی) ا تا ۴۵۵ آصفر × ۱- نامہ پردازی ص۵۷ ۲- نام رکھنا کسی پر "نام آنسو نے مری سلک گہر پہ رکھا" ص۵۸ ۳- جرم رکھنا کسی پر "بجرم نظارہ عبث میری نظر پہ رکھا" ۴- برہم کھانا "کام اک عالم کا برہم کھا گیا" ص۶۱ ۵- خصی ص۶۲ ۶- رُلنا بالضم "تو دیکھو گرمہ خاک میں رُل (ق کھل) گیا" ص۶۴ ۷- یک پلک (پھینٹی کی صنعت) ص۶۵ ۸- جاں گن ص۷۰ ۹- اکرشاکنان ص۷۵ ۱۰- علام = معدوم ص۸۳ ۱۱- طری ؍؍ ۱۲- زور آوری کرنا ص۸۶ ۱۳- نقش ذنگار باندھنا ص۸۹ ۱۴- باایں ہمہ ص۹۹ ۱۵- برہم زن " ۱۶- گستن ص۱۰۴ ۱۷- دوباگا "گہ فارسی کہتا ہوں گہو مصحفی ہندی یعنی کہ مری طبع کا گھوڑا ہے دوباگا" ص۱۰۴ ۱۸- چماں ص۱۰۶ ۱۹- بیاد جانا ص۱۰۸ ۲۰- دنبالہ داری ص۱۱۹ ۲۱- کہوں کہیں "دیکھ میں کہتا ہوں تو رسوا کہوں (ق) ہو جائیگا" ص۱۲۱ ۲۲- نعلیں ص۱۲۸ ۲۳- خلش کرنا ص۱۳۴ ۲۴- من بعد ص۱۳۵ ۲۵- دوختنی ص۱۴۲ ۲۶- رطب مزاجی ص۱۳۶ ۲۷- رنگ فق ہونا ص۱۵۱ فق: ق بجخ ۲۸- نازک کاری ص۱۵۷ ۲۹- قمرغہ ص۱۵۸ ۳۰- قرادلی ص۱۵۹ ۳۱- پیلیں "یار پیلیں اسے کہتی ہیں کہ یہ مات ہے شاذ" ص۱۶۱ ۳۲- بہ شدن ص۱۶۲ ۳۳- جیدھر "رخ یار کا جیدھر گیا ادھر ہی گیا پھر" ص۱۶۳ ۳۴- اذیت کھینچنا ص۱۶۵ ۳۵- افزائش ص۱۷۹ ۳۶- اخلاص بانٹنا ص۱۸۱ ۳۷- فروشندہ ص۱۸۲ ۳۸- خوش ڈول ص۱۸۵ ۳۹- چھٹانا ص۱۸۷ ۴۰- شکنج ص۲۱۵ ۴۱- امرائی "جب تک کہ ترا جلوس امرائی ہے" ص۲۱۹ ۴۲- پردیوچ "دنیا پر دیوچ محض مفہوم ہوئی" ص۲۲۰ ۴۳- باستانی ص۲۲۳ ۴۴- ڈھلڈھلی (صفت چارپائی) ص۲۲۳ ۴۵- لبزج ص۲۲۵ ۴۶- امعار ؍؍ ۴۷- قطور ۴۸- محتبس ۴۹- محلل "محلل بلغم" ص۲۲۶ ۵۰- وصف مونث "ہو زباں تیز یات تانہ مری ص۲۲۷ کس طرح کر سکوں ہوں وصف تری" ۵۱- چونکا ڑھنا ص۲۳۰ مطبوعہ میں خوز؟ غلط محض ۵۲- رسوم بطور واحد "تھی جو اس کو رسوم ماتم کی ص۲۳۵ بارہ دن تک وہ رسم پیہم کی" ۵۳- زود انزود ص۲۳۷ ۵۴- خراجی ص۳۰۵ ۵۵- زجاجی۔

(۵۸) دیوان مصحفی ۲ (علمی مجلس دہلی) ا تا ۴۲۲ آصفر × ۱- تماشاکدہ ص۵ ۲- سالح "سالح نے بھلا کون سی تلوار میں رکھا" ص۱۲ ۳- زنگی ص۱۳ ۴- خرامش ص۱۷ ۵- بارالہا ص۲۱ ۶- ایدھر "کہاں تک ناقۂ لیلیٰ پھرا ایدھر ادھر بھٹکا" ص۲۵ ۷- فزدں ؍؍ ۸- چاؤ بھری ص۲۸ ۹- بھجانا "کبھی خط ہاتھ قاصد کے بھجایا" ص۳۱ ۱۰- نشید خواں ص۴۴ ۱۱- ادھر "اک ساتھ اڑ رہا ہے ادھر کبوتروں کا" ص۴۵

۱۲- شور پڑنا ص۴۸ ۱۳- حد "میاں مصحفی کہا میں یہ بات حد بری ہی ص۵۳ ہر اک سے راز دل کا افشانہ کیجیے صاحب"
۱۴- پردگی ص۶۰ ۱۵- قنات کھنچنا" ۱۶- گیٹ " مصحفی دور ہے فرنگیوں کا ص۶۱ کام ایسا نہ کر کہ کھاوے گیٹ"
(ق سمیٹ) ۱۷- کم بغل ص۶۴ ۱۸- علاج لینا " لیتا ہے کم بغل کوئی عطار کا علاج"" ۱۹- سپید باف ص۶۸
۲۰- نیات ص۷۸ ۲۱- کیدھر "کیدھر چلی ہو دھوم نہ مچواؤ میر کر گھر" ص۸۰ ۲۲- لبیاری ص۱۰۲ ۲۳- قریات
ص۱۲۱ ۲۴- دودہ ص۱۲۳ ۲۵- چہرہ افروزی ص۱۳۶ ۲۶- ریل "کون سا وقت ہے کہ آنکھوں سے ص۱۳۸
سیل خون جگر کی ریل (ق پھیل) نہیں" ۲۷- بطالت ص۱۴۷ ۲۸- مغز پھرانا ص۱۴۸ ۲۹- تعب
کھینچنا ص۱۵۰ ۳۰- مغروری ص۱۵۶ ۳۱- خانہ برانداززی ص۱۵۷ ۳۲- قیافے سے دور ہونا" لیلیٰ
کا محمل اس کی محافے سے دور ہے ص۱۶۵ یہ بات تو کچھ ابھی قیافے سے دور ہے" ایسی غزل کہی کہ
قیافے سے دور ہے" ۳۳- معما کھولنا ص۱۷۲ ۳۴- کم نگہی ص۱۷۲ ۳۵- لاف مارنا کسی سے ص۱۷۸ ۳۶-
نظارہ مارنا" اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے" ۳۷- تغابر ص۱۸۷ ۳۸- بقم" ۳۹- آگو = آگے
ص۱۸۸ + ۴۰- کاغذ گر ص۲۰۰ ۴۱- اپاہا" نکلی کسی صورت تو مرے دل کی اپاہا" ص۲۲۳ ۴۲-
بریز بریز کرنا" سو تو اس کی زباں ہے ایسی تیز ص۲۳۴ جس سے کرنے لگیں بریز بریز"۔

تحفۂ مصنف بخدا بخش لائبریری

• حسین خدیوجم، مستشار فرہنگی، سفارت کبرای ایران در کابل

۱- آن روزها - ترجمہ الایام، تصنیف طٰہٰ حسین، تہران، چاپ خواجہ، ۱۳۵۰ شمسی، ۳۸۴ ص -

—— ترجمۂ خودنوشت طٰہٰ حسین -

۲- گفت و شنود فلسفی در زندان ابوالعلا معری - ترجمہ مع ابی العلا فی سجنہ، تصنیف طٰہٰ حسین -

تہران، انتشارات زوار، ۱۳۴۴ شمسی، ۲۸۷ ص -

۳- ترجمہ احصاء العلوم، تصنیف ابونصر فارابی، تہران، بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۶ ص

—— علم زبان، علم منطق، ریاضیات، علم طبعی، علم الٰہی، علم مدنی، علم فقہ، و علم کلام

۴- ترجمہ رسالہ اضحویہ، تصنیف ابوعلی سینا، با تصحیح و مقدمہ و تعلیقات - تہران، بنیاد فرہنگ ایران،

۱۳۵۰ شمسی - ۱۳۶ ص -

—— در معاد ؛ ابطال مذہب تناسخیان ؛ جوہر روح و پس از مرگ -

۵- میراث مشترک فرہنگی در ایران و مصر، تہران، ۱۳۵۴ شمسی - ۴۶ ص

۶- ترجمہ جبر و مقابلہ، تصنیف محمد بن موسیٰ خوارزمی، تہران، چاپخانہ خواجہ، ۱۳۴۸ شمسی، ۱۹۰ ص

۷- احیاء علوم الدین، تصنیف امام غزالی، ترجمانی مویدالدین محمد خوارزمی - ترتیب و تصحیح - تہران،

بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۵۲ شمسی، ۵۳۵ ص

—— کتاب شرح عجائب دل ؛ کتاب ریاضت نفس ؛ کتاب آفت ؛ شہوت و فرج شکم ؛ کتاب آفتہای زبان ؛

کتاب آفت چشم وغیرہ -

۸- احیاء علوم الدین - ج ۲ - ربع مہلکات، تصنیف غزالی، ترجمانی مویدالدین محمد خوارزمی،

تہران، بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۵۱ شمسی، ۴۵۱ ص

—— کتاب علم ؛ کتاب قواعد عقاید ؛ کتاب اسرار طہارت و مہمات آن -

۹- احیاء علوم الدین ج ۳ : دنبالہ ربع عبادات -

—— اسرار نماز ؛ اسرار زکات ؛ اسرار روزہ ؛ اسرار و مہمات حج ؛ اسرار تلاوت قرآن ؛ ذکرہا

و دعاہا، ترتیب وردہا - شمسی ۴۸۶ ص

۱۰- مسیر طالبی یا سفرنامہ ابوطالب خان (لکھنوی اصفہانی لندنی)، تہران، فرانکلین، ۱۳۵۲ شمسی

—— سفرنامہ یورپ در ۱۷۹۹ - ۱۸۰۳ء

• **شاہ ابوالحسن زید فاروقی، درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی-۶**

۱- علامہ ابن تیمیہ: علمی تحقیقی جائزہ۔ درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی-۶، ۱۹۷۶ء، ۱۲۹ص
— دہلی کی مشہور نقشبندیہ درگاہ کے سجادہ نشیں کے قلم سے "قال النبیؐ انزلوا الناس منازلھم" کے سر آغاز کے ساتھ ایک عالمانہ جائزہ۔

۲- حضرت مجدد اور ان کے ناقدین، درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی ۱۹۷۷ء ۲۵۵ص
— عکس خط حضرت مجدد؛ احوال و تالیفات؛ شیخ اکبر اور حضرت مجدد؛ شواہد تجدید؛ آپ کی مخالفت؛ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی کتاب کا جائزہ۔ پروفیسر محمد مجیب کی تحریروں کا جائزہ؛ انوار الحق کی کتاب کا جائزہ

۳- مقامات خیر، دہلی، درگاہ شاہ ابوالخیر، ۱۹۷۲ء - ۸۰۰ص
— احوال حضرت شاہ ابوالخیر عبداللہ محی الدین فاروقی مجددی دہلوی قدس سرہٗ - اس کا فارسی ترجمہ بھی ۱۹۷۷ء میں چھپ چکا ہے۔

• **محمد ظفیر الحسن، کراچی**

۱- دیوان دل عظیم آبادی (ترتیب) کراچی ۵، مکتبہ مہر نیمروز، ۱۹۷۴ء، ۱۶۸-۱۸۴ص
— پیش گفتار سید وصی احمد بلگرامی مرحوم کے قلم سے جنہوں نے نسخۂ دیوان دریافت کیا؛ علی ابراہیم خان (جن کر خاندان سے یہ نسخہ ملا) کے خاندان کا حال بھی درج کیا ہے۔
— مقدمہ (۱۳۰ص): خاندانی حالات؛ دل تذکروں اور کتابوں میں؛ احوال دل؛ بعض معاصر شعرا؛ دل کی شاعری؛ الفاظ و محاورات؛ دل اور غالب۔

• **اختر راہی، سرگودھا**

۱- مسعود عالم ندوی: سوانح و مکتوبات پاکستان، سرگودھا روڈ، پنجاب ۱۹۷۵ء، ۱۰۴ص

• **م - احمد، دہلی**

۱- دل لگی اور کچھ دل کی لگی، دہلی، الجمعیۃ بکڈپو، ۱۹۷۵ء، ۱۲۸ص
— طنزیات

۲- شگوفے، دہلی، الجمعیۃ بکڈپو، ۱۹۷۴ء ۱۰۴ص
— طنزیات

• **شکیل احمد صدیقی، الہ آباد**

۱- تصوف اور اس کی مختصر تاریخ، لکھنؤ، نعمت اللہ روڈ امین آباد، ۱۹۷۴ء، ۲۰۶ص

• **جالب کاشمیری، سری نگر**

۱- دیوان جالب، سری نگر، ستھراشاہی کالونی، ۱۹۷۴ء، ۳۶۰ص
— ساڑھے چار سو کے قریب کشمیری افراد کی تصویریں اس کتاب میں مل جائیں گی جو بیسویں صدی میں کسی نہ کسی اعتبار سے مشہور ہیں۔ ••

ted ideas. He has proved that the present calendar should be rejected and replaced by a purely solar reckoning, and once this is accepted the adoption of the WORLD CALENDAR will follow as a necessary corollary, being a distinct improvement over the present system. . Dr. Ali has indicated the correct line of approach to the problem. . . It is now for the Muslim leaders to think and to act.

"I believe that the inexorable forces of nature will sooner or latter carve out a path for the truth of this thesis, through the religious dogmas and superstitions in which much of the Muslim world is still submerged. I congratulate him on his bold liberalism and I am sure his ideas will have the widest publicity in the realm of the Crescent."

—Prof. Prankumar Ghosh, Vishva-Bharati University, Bengal, J of C. R. New York, Dec. '53, p. 190.

5. At the end of the Alberuni and Aryabhata Seminar convened by the Abul Kalam Azad Oriental Research Institute in May 1977, it was R E S O L V E D that :

THE STUDY OF ISLAMIC SOLAR AND LUNAR CALENDARS BE REJUVENATED KEEPING IN VIEW THE SUGGESTIONS OF DR. HASHIM AMIR ALI.

—Resolution moved by Khwaja Muhammad Ahmad,
Seconded by Dr. Saleh Mohammad Alladin.

Extracts from COMMENTS on Hashim Amir Ali's Thesis

1. "..there is ample material, both literary and traditional, to prove that a calendar which had some kind of seasonal basis and in which 'intercalation' was also provided was in vogue in the time of our Holy Prophet. It is also mentioned in early Arab literature that the knowledge of adjusting the additional month .. was possessed by a certain family, and it was often misused... In such circumstances, verses 36 and 37 of the IXth Sura of the Holy Qur'an were revealed .. which prohibited intercalation. The Hijri calendar has stood the test of nearly fourteen centuries .. Dr. Amir Ali's views however offer sufficient scope for re-examining the problem, particularly if the above verses of the Holy Qur'an were interpreted according to his reasoning."

   —Dr. Ghulam Yazdani, Director Archaeology, and author of repute, (d. 1962): in his Introduction to *Facts and Fancies*, by Hashim Amir Ali, Hyd. 1947.

2. "Dr. Ali has put his finger on an important question which is not only a religous matter but also one with secular implications. He has successfully shown that the use of the lunar system in Islamic countries was originally due to an error and misunderstanding, that it was not an absolute religious necessity, and that it can be changed without any damage to the faith. I wholeheartedly agree with his approach and conclusions."

   —Professor Niazi Berkees, of Turkey, Institute of Islamic studies, McGill University Montreal, Canada Journal of Calendar Reform, N. Y. Sept. '53.

3. "There is a great deal of truth in Dr. Ali's position. His ideas ought to be widely broadcast."

   —Editor Abdul Majid, of the Islamic Review, woking, London, ibid.

4. "Dr. Ali's thesis has ushered in a new era of progressive ideas in the realm of the Crescent .. Dr. Ali has given the 1300-year old calendar rather a mighty jerk and twist at its very root. In doing so he has behaved most admirably; he has nowhere taken cover behind a smokescreen of untenable hypotheses or distor-

9. *The Message of the Qur'an-Presented in Perspective*, Charles E. Tuttle Co. Rutland, Vermont and Tokyo, Japan. A full translation of the Qur'an, with the 114 Suras with original Arabic text presented in perspective order. The *Nasi* explained in Appendix C, at the end of the volume.

10. The Genesis of the Purely Lunar Calendar and its Influence on World History. A printed Paper distributed at the meeting of the American Oriental Society, held in the Museum of the University of Pennsylvania, Philadelphia, Penn. in March 1976.

11. The 'Month' in the Qur'an, ISLAMIC CULTURE, Hyderabad, India Vol. II, No. 1, January 1977.

EARLIER COMMUNICATIONS

1. *FACTS and FANCIES*, Hyderabad, India, 1947. A book of essays, a majority among them analysing the four calendars then prevalent in Hyderabad State, and submitting for the first time the thesis that the two verses of the Qur'an (IX : 36-7), generally interpreted as the prohibition of intercalation, in fact, implied a suggestion to adopt the purely solar calendar then prevalent both among Iranians and Christians as against the luni-solar calendar of the Jews, which was then being followed more or less closely, by the Muslims.

2. English translation of Caussin de Perceval's article on the Arab Calendar before Islam, published a hundred years ago in *Journal Asiatique*, Paris, in 1843. ISLAMIC CULTURE, Hyderabad, India, Vol. XXII, No. 1, April 1947.

3. Fresh Observations on Perceval's 100 Year Old Notes on the Arab Calendar before Islam, ISLAMIC CULTURE, Hyderabad, India, Vol. XXII, No. 2, April 1948.

4 The Crescent and the Moon, JOURNAL OF CALENDAR REFORM, New York, Vol. XXIII, No. 2, June 1953. This article repeated the thesis originally presented in *Facts and Fancies*, 1947, and suggested that the Muslim countries accept the proposed World Calendar then under consideration of the United Nations.

5. The First Decade in Islam, THE MUSLIM WORLD, Hartford, Connecticut, April, 1954. Referred to by Montgomery-Watt in *Mohammad in Medina*, p. 339.

6. India's Calendar Horizons, JOURNAL OF CALENDAR REFORM, New York, April, 1954. A resume of the four calendars analyzed in item 1 above.

7. The Jewish Origin of the world Calendar, JOURNAL OF CALENDAR REFORM, New York, December 1954.

8. Must the Hajj Rotate Round the Seasons ? ISLAMIC REVIEW Woking, England, March 1956.

the solution which has now been discovered and elaborated in these lectures :

> "My own theory, which I hope one day to support with evidence, is that the transposition of a mid-summer month to mid-winter was probably the outcome of a sudden change of the month of Hajj from the autumn to the spring and the consequent juxtaposition of the two halves constituting the Arab year."
>
> *Dr. M. Hamidullah*, of the Osmania University, on reading this paper in manuscript, tells me that it is even possible, though not likely, that such a transposition took place during the brief all-round sway of the Fatimide dynasty which was notorious for its unorthodoxy : like many other notable incidents in history, it is not impossible that the record of this also was lost in oblivion.

3.48. See Islamic Culture; The 'Month' in the Qur'an, Section IV, January, 1977.

3.51. See note to 1.5

3.53. See in note 3.41 above how this had been foreshadowed 30 years earlier.

3.54. See note to 2.13.

Lecture III

3.26. "In 1953 the annual pilgrimage . . came in mid-summer. Ahmad Kamal in the Saturday Evening Post wrote that the heat ranged between 116 and 127 degrees and on one day the mercury climbed to 142 causing the death of 4,411 pilgrims on that day alone. And all this tragic loss of life was due to the non-seasonal moon calendar !" (Journal of Calendar Reform, New York, Jan. 1954 p. 79)

3.29. See para 11 in M. Hamidullah's article mentioned in note 2.13 above.

3.36. See Note 1.20 above.

3.40. By that time Islam had already spread far and wide. Perhaps there lay a further attraction in having a unique calendar which was not even adjustable to those of the Iranians, the Christians and the Jews all of whom were now regarded as conquered peoples. This pride in distinction and uniqueness, a very human weakness, was displayed in our own times by Muhammad Ali Jinnah when he eulogized his 'two nations' theory in the following memorable words :

> "We are a nation of hundred millions with our own distinctive culture and civilization, language and literature art and architecture, names and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and *calendar*, history and traditions, aptitudes and ambitions, in short, a distinctive outlook on life and of life. Hindus worship the cow, we eat it and our heroes are their enemies."

I remember my attention being particulaly drawn to the word 'calendar' when reading the above statement displayed prominently in the Muslim League Camp in Delhi a few months before the partition of the subcontinent.

3.41. The following verbatim extract from my unpublished book, FACTS and FANCIES, printed and bound by the Central Government Press of the then Hyderabad State, in 1947, just prior to the Partition of India, will show how closely I had reached, within three years of having started on the search, to

Eduard Mahler, Leipzig, 1916. A photostat copy of this table given to me by Professor Baron of the Jewish Seminary, New York, in 1953, has been invaluable to me in my study of the *Hijrah era*.

1.36. The word *Ḥajj* also implies a time and place for social mingling and settlement of disputes by arbitration or other peaceful means. See Sura 2 : 189 as well as the note on that verse by the present writer given in the Appendix of Mirza Abul Fazl's *Gharib ul Qur'an*, an Urdu dictionary of the Qur'an printed in Hyderabad, India in 1947, pp 432-4.

1.49. *Memoire Sur le Calendrier Arab Avant L'Islamism*, an article by Caussin de Perceval in the Journal Asiatique, Paris 1843. For English translation see Islamic Culture, Hyderabad, April 1947, p. 150, footnote.

1.51. *Annali Dell' Islam*, compiled by Leone Caetani, Milan 1905. In ten volumes; Vol. I covers the years 1 to 6 A. H. in its 740 pages.

1.55. See Note on 1.25 above.

Lecture II

2.13. This is an off-print of his article entitled, The *Nasi*, the *Hijrah* Calendar and the Need of Preparing a new Concordance for the *Hijrah* and Gregorian Eras. In this the auther makes the following important statement :

> "The *Hijrah* calendar is the direct successor of the Makkan luni-solar calendar which practised *nasi* (intercalation). Axel Moberg's researches on *Nasi* in German (*an-Nasi*, Lund. 1931) date from 1931, and of course new sources have have since become available. *Except the last three months, the Prophet passed his entire life under the old order* (emphasis added). It is therefore indispensible that relations between the two calenders should be investigated anew when new material has come to light or new avenues are opened for one reason or another."
>
> (Journal of the Pakistan Historical Society, Vol. XVI Pt. I, Jan. 1968 pp 2-3)

NOTES

Lecture I

1.5. Abdullah Yusuf Ali's Appendix No. XI (pp. 1077-8 in his English translation of the Qur'ān) gives several examples to show the unbelievable chaos in fixing the dates and sequence of events even during the end of the Prophetic mission. It is not the paucity of dates but the abundance of mutually contradicting estimates that leads to this confusion. It is the basic cause of this confusion that these lectures are meant to reveal.

1.20. Ishaqun Nabi 'Alavi gives the following references to the *Ḥajj al Aṣghar*, also known as *'Umrah* which used to assemble at Mecca during the month of *Rajab* : "Ṭabari III, 157 and 174; Baihaqi, *Sunan*, IV, 345." This month of *Rajab* coinciding with the Jewish moon-month of *Nisan*, and covering the vernal equinox, was considered the most sacred among the Four Sacred Months known as the *ashhur ul ḥurum*. See Burhān, Delhi, November 1964, pp 283-4.

1.22. See M. Hamidullah's references to these tithes in his two books : *Introduction to Islam*, 1968, paras 175 b and 349; *Muḥammad Rasulillah*, 1974, paras 20, 39 and 263.

1.25. Obviously the Jewish and the Arab year was originally identical, both commencing close to the autumnal equinox, the first month being named *Tishri* by the Jews and *Muḥarram* by the Arabs. Exodus XII : 1-6 testifies how, on their return from exile, the Jews were enjoined to transfer their New Year from this first month *Tishri* to their seventh month *Nisan*, that is from the autumnal to the Vernal equinox. With this transfer of the new year from *Tishri* to *Nisan* the intercalary thirteenth month, which had to come at the end of the year also had to be shifted to a place between *Adar*, the last month and *Nisan* the first month of the next year; this intercalary month corresponding with the Arab *Nasi*, was named *Veadar* or the 'extra *Adar*'. This feature of the Jewish calendar is clarified in the Table on pages 540-1 in *Handbuch der judichen Chronologie* by Dr.

64. All that I request my audiences, and the readers of the printed versions of my lectures, is to do their best and utmost in these next three years, to initiate discussions, to weigh both pros and cons and to get a verdict on whether my thesis is plausible and acceptable or puerile and unwarranted. This, it seems to me, is a duty of all those who come in contact with this problem, a duty which they owe to Allah, to the Qur'an and to the Prophet; to the Muslim community and the rest of humanity. Let there be a candid controversy throughout the Muslim world over this issue. Let the learned of the East and the West try to tear it to pieces. And if, even at the end of three years, the men of vision in the *Ummah* cannot accept the validity of my thesis, nothing further can or needs to be done. They will have done their duty, even as I have done mine.

65. If, on the other hand, the efforts of my listeners and my readers lead to an affirmative consensus on my thesis, the answer to the question whether anything needs to be done or not for the future will itself come to the surface in the minds of those who are convinced of the validity of my thesis. No forecast can, or need, be indulged in before such a situation arises.

66. The five years between the time-points 'a' and 'b' will then provide ample time for deliberating on what exactly needs to be done and how the change is to be effected at the end of these five years. Time-point 'b' will provide an opportunity which will not recur again for the next 33 years.

67. If, however, this time-point 'b', the Autumnal Equinox of 22nd September 1985, is taken advantage of, the rennaisance of Islam, will have commenced only eight years hence !

---

how the recasting of the *Sirah* can be hoped for through fresh approaches and new talents. But it would be dishonest for me to say that beyond this point I am not interested in any reform of the Muslim religious calendar in the future.

H. The Future

60. That, however, is a problem for the *Ummah* and the *Ulu'l amr* (*Nisa* 4:82) 'those deserving of command', and the *Ulu'l aydi wa'l abṣār* (*Ṣād* 38:45) 'men of action and foresight', 'the *Ulu'l faḍl waṭ ṭaul* 'men of generosity and means', to deliberate upon.

61. Besides, as I have already said at the beginning of this last lecture, calendrical modification or reform is not a phenomenon to be treated as child's play or pushed through in a hurry. Years of deliberation at the highest intellectual levels of the *Ummah* will be needed to arrive at a modus operandi which will not throw Islam from confusion into chaos.

62. Such a problem becomes all the more risky in times such as ours when things move so fast that a single thoughtless deed or word carries its reverbrations over the globe in a matter of seconds and when we are not quite sure as to whether mankind itself will survive to witness the opening of the 21st century. We have at this moment little knowledge of what new vistas or what clamities will face mankind during this last quarter of our current century.

63. Restricting ourselves, therefore, to the fate of only the peculiar calender that we Muslims have inherited, I can see three points of time which are significant :

(a) The transition point of our unadjusted lunar calendar from its 14th to its 15th century. Such points always evoke resolutions for the future and give rise to thinking and emotional fervour. This particular point of time the 1st of *Muharram*, 1401 A. H. will coincide with Sunday, 11th November 1980, a little more than three years from now.

(b) The 22nd of September 1985, when the 1st of *Muharram* 1406 A. H. will fall close to the Autumnal Equinox and re-railment of the Muslim Calendar from the orbit of the moon to the orbit of the sun will be most feasible at that point of time. The duration between points 'a' and 'b' will be only 5 years,

(c) The transition of the Western Era from its 20th to its 21st century. The current year being 1977, another 23 years intervene between now and then.

G. Reconstruction : Possibilities and Limitations

57. It will now be obvious that much of the *Sirah* has to be chronologically reconstructed in the light of the thesis that has been unearthed by the application of inductive analysis to the scanty records. We now have a scale against which to test and adjust the recorded data. Such an effort will either set the events and their sequence in obvious order, or it will prove the inadequacy, perhaps, the **falsity** of my thesis and of the scale itself. Unfortunately, even the latter outcome will not help much; we shall still need an alternative formula and scale which will meet the needs better, and which will clear away the discrepancies that abound. Until such a formula and such a scale are discovered we have only two alternatives before us—either to work with this new formula as a tentative hypothesis, or to continue to be smugly satisfied with the old chronological chaos which 'Alavi laments with such poignancy.

58. In any case, such a reconstruction of Islamic chronology cannot be expected from any individual, or group of pedants, committed to the old deductive system of reasoning in which every new idea has to be corroborated by precedent and tradition rather than by experiment and trial and error, supplemented by logical inference. Only persons familiar with the scientific method, those who are as willing to unlearn as to learn, can be expected to make headway in this labyrinth of doubtful information where there is much more to reject and discard than to accept or add. It is this need that throws wide open the doors of Islamic research to the many, instead of limiting this responsibility to the few who claim the monopoly of knowledge in the field of Islamic historiology. No person who claims to be a Muslim and has worked for a high research degree, or has published some papers, no matter in what field, can be absolved from the duty of examining the *Sirah* literature with a view to obtaining for himself, if not for others, a logically clear perspective of the Prophet's life, his aims and his achievements. It is only the siftings by such a multitude of laymen that will give us a clearer picture of the Prophet, the greatest benefactor of Muslims—if not of mankind.

59. Here my task as a researcher ends. I have outlined my thesis and have explained the basis of the contradictions found in *Sirah* literature; I have, in short, shown that it is an expedient solution of a problem raised by the entanglements of history that has led to the roving *Ḥajj* and the roving *Ramaḍān* over the past nearly fourteen centuries. I have even gone slightly beyond my sphere in suggesting

(ii) If the *Nasi* existed till then, it must have occurred three times during the preceding 10 years. Where then have these three months disappeared ? What other explanation than this thesis clarifies this effacement ?

(iii) Coming downstream, one finds the Farewell Pilgrimage to correspond with the *Minor Ḥajj* of the spring month of *Rajab*, and corresponding closely with the Vernal Equinox. Going upstream from this very current month of *Rabiʿath-thani*, 1397 of the Hijrah era, we find that the vernal equinox of 10 A. H. corresponds with the month of *Dhu'l Hajj*. How else but through this thesis, can one explain this overlapping of the *Major* over the *Minor Ḥajj* ?

(iv) According to all *Sirah* and *Hadith* literature, the *Hijrah* occurred in the month of *Rabiʿal-Awwal*, A.H. 1. Is there a single tradition mentioning the immediately preceding months of *Safar* and *Muharram*—the very first two months of the first year with which the Muslim Era commenced ? How have these two months become non-existent ? How else, but on the basis of this thesis, can one explain this disappearance ?

55. When not one, not two, not three, but all these four contradictions are explained away by a single thesis; and when, further, there is no alternative thesis to clear away even one of these four contradictions, what alternative is there to the acceptancc of this thesis ?

56. I admit that the acceptance of this thesis is a painful experience to every Muslim. It hurts our cultural ego. As a born and avowed member of the Muslim community, my individual ego too cannot but be pained at the exposure of this wide crack in the armour of our age-old traditions. But, if I have been aroused by even one of the glories of the Qur'an, it is its sincerity, its honesty, its presentation of facts without any attempts at dilution or toning down in consideration of human weaknesses. If I am asked to point out the most outstanding features in the character of our Prophet as I see him reflected in the Qur'an, I can point to no other than his straightforwardness, his transparent honesty, his refusal to compromise with regard to truth. Such being the teaching of the Qur'an and such the example set by the man whom we accept as our Prophet, shall we shirk our duty of accepting a logical thesis which we cannot prove to be false ? Is it not imperative on us to overcome hesitations prompted by both our individual and our collective egos ?

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم در کشم ترسم که مغز استخوان سوزد

with the seasons; one is left with the only conclusion that most probably all the details were either simple fabrications, or pious intellectual exercises on the part of the early preachers of Islam who were too innocent to visualize that their versions might be scientifically examined at some later stage of history.

"On the other hand, there are examples of dates that are obviously authentic and correct; these are not many but sufficient in number to suggest that the early Sirah writers had some basic source material at their disposal; otherwise there would have been contradictions in these also.

"This makes the issue all the more complex." (p. 2)

51. Lest this honest fellow-seeker be suspected of having indulged in overstatements, I might mention that his verdict is based on no less than 148 references to Ibn Ishaq, Waqidi, Ibn Hisham, Tabari, Albiruni and last of all William Muir whom we too have quoted.†

F. Removal of Doubts

52. But one other duty I must fulfil, even at the risk of repetition, before I conclude : I must anticipate at least some doubts about the credibility of the thesis itself and also answer some questions that the thesis naturally leads to. This I shall now try to do, as briefly as I can.

53. Many of you will naturally want to ask : How is it that a vital chronological manipulation, like the one I assume as a hypothesis, finds no mention in all the copious *Hadith* and *Sirah* literature ? The answer is that the very purpose of the manipulation seems to have been to obliterate the *Nasi*—not only its stem and branches but its roots as well. How then could this effacement itself be incorporated, or allowed to exist, in historical records ?†

54. You will ask : Have you no other than circumstantial evidence to support this disturbing thesis ? Humbly, I admit that I have only negative evidence. Let me summarise the logic and sequence of my thinking which has led me to this hypothesis :

(i) If the adjusting *Nasi* had not been in practice till the Farewell Pilgrimage, how could it have been called "a recurrent cause of confusion" in Surah *Bará'ah* 9:37 which, as I have shown, is generally accepted as being associated with the *Hajjat al Widá'* ?† Is there then any alternative to accepting that the months were seasonal even during the ten years of the Medinan period ?

exposed to the charge of not having availed of the inviolability of the later half of of *Dhu'l Ḥajj* immediately following the Second Pledge of 'Aqaba. Worst still, aspersions have been cast on his sense of loyalty by the prevailing belief that he had left at night in search of safety while deliberately leaving his cousin and protege to face the wrath of the discomfited and frustrated Quraish during a month in which there was no guarantee of safety !

47. As we tried to show at the end of the first lecture, this exodus of the Muslims had been planned and executed more precisely than the exodus of the Israelites from Egypt. But, thanks to the cynical manipulation recommended by the Qalammas, the *Sīrah* of the Prophet has been blemished rather than ornamented by the traditions which are still innocently accepted.

48. The tragedy extends even to the blurring of some passages of the Qur'an. For example, if the three months of the Nasi had not been effaced from Muslim records, it would have been clear that the month of *Ramaḍán* throughout the life of the Prophet had corresponded with the May-June season of the year. Hence the injunctions on fasting, revealed a decade **before** the elimination of the *Nasi*, applied to that particular season. Nor was there any sacredness attached to that month. Many of the active adults used to be away from their homes either on trade or on administrative duties. Badr had occurred in *Ramaḍān* : the submission of Mecca also dates in the same month. Is it, therefore, possible that the verse enjoining fasting, (*Baqarah*, 2 : 185) applies only to those who stay at home in that month ?†

49. I am not saying that it does; all that I wish to convey is that it is this double exposure of the Medinan decade that has led to the two alternative interpretations of the word *shahr* in that verse; some comentators take it to mean the 'moon', others the 'month', We laymen are left to decide for ourselves, without having any clear evidence, on which of these to base our decisions.

50. Without further elaboration of this blurring let me quote another layman, Ishaq un Nabi 'Alavi who has had much more access to *Hadith* and *Sirah* literature than I could ever hope to. Mentally battered and bruised in this debris he says :

> "... in the chronological analysis of all important events, there are apparent contradictions and variations on such a vast scale that these narratives can hardly be regarded as history. Neither the days tally with the dates, nor the months coincide

thesis. Of course, this thesis, like all other theses, is open to refutation, but that could be done only by another thesis which is still more formidable and irrefutable. Until such a thesis appears, this one would serve to reconcile many seeming irreconciliables. Naturally, I felt like shouting Eureka !

E. Resulting Dislocations

43. The expectations of the Qalammas were fulfilled. This ingenious manipulation seems to have aroused little notice amidst the great conquests extending to Khurasan in the north-east, to Egypt in the south-west. Naturally, it went entirely **unrecorded**. The succeeding tumultuous regime of the Bani Umayyah buried it deeper still and beyond even the reach of the collective subconscious.

44. When more than a hundred years later, Ibn Ishāq and Wāqidī, Ibn Hishām and Ibn Sa'd tried to recapture and martial the sequence of events, they found all the twelve months of a lunar reckoning, unbridled by the seasons, ubiquitously appearing here and there without rhyme or reason. Historical records were all in disarray; the formula of the Qalammas, which would have provided a scale of adjustment was nowhere to be found for solving this inherited jig-saw puzzle.

ڈھک تپہی کے ہو، مقام پہ دو چار رہ گئے
ڈیرا بتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

45. It could not have been otherwise. All the events of the Medinan decade had been subjected, so to say, to a double exposure; subsequent attempts to etch in the correct outlines had further blurred the images almost beyond recognition. In trying to comply with the demand for presenting a clear picture, these historians had no alternative but to make use of their own imaginations :

چون نه دیدند حقیقت، ره افسانه زدند

46. Perhaps the most conspicuous instance is the imaginative building up of the Hijrah narrative. Just because the manipulation of the Qalammas had shifted this effulgent event of early Islam from the sacred months of *Dhu'l Hajj* and *Muharram* to the ordinary month of *Rabi'al-Awwal* during which violence was *not* taboo, the sagacity and the careful planning of the exodus from Mecca to Medina have been regrettably overlooked. Instead, the Prophet has been

literature; likewise, no one has thought of asking the question which may have been framed as follows :

"If the *Hijrah* had taken place in *Rabī'al-Awwal*, is there no record whatsoever of any events that occurred in the immediately preceding *Ṣafar* and *Muḥarram* ? Is there nothing worth mentioning in the very first two months of the Muslim era ?"

The answers to these questions will corroborate my thesis. No events can be attributed to these two months of *Ṣafar* and *Muḥarram* simply because these two months had no existence; in reality they were the months of *Dhu'l Qa'd* and *Dhu'l Ḥajj*, the latter being the month in which the *Hijrah* had commenced.

41. Years ago, my own intermittent attempts to reconcile what seemed to be irreconciliable had made me suspect that some tinkering at some time in Islam's history had made the moon calendar take a half turn on its axis making vi into xii and xii into vi.† I even remember telling Dr. Hamidullah while he was still in the Osmania University i. e. before 1947, about this possibility; I even remember his suggesting that something of the kind might have been done under the Fatimid regime in Egypt. Later, I had tried to explain to my friend and colleague, Syed Kazim, what seemed to be a transformation of the *Minor Ḥajj* into a *Major Ḥajj*. But when ? Why ? By whom ? Under what compulsions ? and lastly, what evidence had I ? all these questions I could not answer. Therefore, for long I had failed to make this thesis convincing to others or even to myself. It was this chagrin at seeing the solution behind a thin veil, so to say, and its elusive play of hide and seek that had made me gnash my teeth over and over again during the last three decades !

42. But now all these questions can be answered with arithmetical precision. The basic motive was apparently the effacement of the *Nasi*—the removal of the contradiction between (a) the denigration of the *Nasi* in the Qur'ān, and (b) the factual retention of the *Nasi* during the very first decade of the new Muslim era. The person responsible for this ingenious manipulation could have been no other than a member of the Qalammas clan. The numerous references to calendrical adjustment in the 16th or 17th year of the *Hijrah* era pointed clearly to this period in the regime of the Second Khalifah, 'Umar, the Conqueror of Syria, Iran and Egypt, who had been long known for his capacity to cut such Gordian knots. The findings of these missing links had made my reasonable conjectures into a formidable

Qalammas clan to provide a solution. It was apparently a shrewd representative of this calendar-manipulating clan that had solved this dual problem in his own cynical and spiteful style.

38. It must be remembered that the elimination of the *Nasi* in the time of the First Khalifah had already deprived this clan of its prestige, perhaps even of its livelihood. Now one of this clan was being asked by his detractors to remove the consequent anomalies in their time-reckoning and for this purpose to use, so to say, the know-how of his discredited occupation ! If this Qalammas of Arabia had had a sense of humour equal to that of the Brahmin of India, he might have said :

ببین کرامت بتخانهٔ مرا ای شیخ
که چون خراب شود خانهٔ خدا گردد

Anyway, assuming this situation, my personal deciphering of the records, written between the lines, with invisible ink, has suggested that the seemingly attractive formula provided by this virtuoso was somewhat as follows :

39. "The Farewell Pilgrimate, the *Ḥajjat-ul widā*ʿ, had concurred with the *Ḥajj al Asghar*, the Minor Pilgrimage of *Rajab*. In view of the supreme importance which this occasion had acquired after the demise of the Prophet, this 'minor' Ḥajj could legitimately be given the status of the 'major' Ḥajj by giving to this month of *Rajab* the title of *D̲h̲u'l Ḥajj*. This will advance the year 5 months by transforming the 7th month into the 12th month of that year. From this titled month of *Dhu'l Ḥajj* go back upstream on the river of time naming the months retrogressively *as if* there had been no *Nasi*. This procedure will efface the 3 months of *Nasi* by having given them the names of three ordinary months; the remaining two months *Ṣafar* and *Muḥarram* will recede behind the horizon of the *Hijrah* and be lost in the darkness of the pre-Hijrah Meccan period. They will be overlapped by the last two months of *Dhu'l Ḥajj* and *D̲h̲u'l Qa'd* of the old *Nasi*-adjusted epoch. In time, the addition of these 2 months also will be effaced from Muslim memory even as the 3 months of *Nasi* will have been effaced from the first decade of the newly introduced Muslim Era."

40. This is exactly what seems to have been done†. The 3 months of *Nasi* that had actually occurred in the Medinan decade of the Prophet's life as months of *Nasi* assumed other names in the *Sīrah*

present and the future; but when, and by what *mantra* was their existence **effaced** from the past ?

34. This was the question the answer for which had eluded me for thirty years. It had seemed an unanswerable question when fourteen centuries had buried the scanty historical records to depths unreachable. It was only the concentration and mental strain experienced in the course of preparing these very lectures that brought the answer to the surface. I was, and will continue to be, amazed at the answer which suddenly appeared before me.

35. Yesterday I presented to you the chart fixing the important events of the Medinan decade according to the months of the Julian, the 'Downstream' and the 'Upstream' calendars. Column 6 of this chart had revealed a peculiar rise of numbers in the difference between the two above-mentioned lunar reckonings : every time a *Nasi* month had intervened, the difference had increased by 1. For example, the month of the *Hijrah* was *Muharram*, the 1st month of the year according to the Downstream reckoning; *Rabi'al Awwal*, the 3rd month according to the Upstream reckoning; the difference between 3 and 1 was 2. But, after passing one *Nasi*, such difference became 3. After traversing over the next two *Nasi* months such difference rose from 3 to 4 and then from 4 to 5 !

36. And wonder of wonders ! This made *Rajab* the seventh month of the 10th year in the Downstream calendar correspond to the *D̲u'l Ḥajj* the twelfth month in the Upstream reckoning ! The month of the *Ḥajj al Akbar* had become superimposed upon the month of the *Ḥajj al Asghar* !† There lay the answer for which I had been racking my brain for three decades. Someone had managed not only to transform the *Ḥajj al Asghar* into the *Ḥajj al Akbar* but also to efface the three *Nasi* months which would, otherwise, obtrude so glaringly in a decade at the end of which the *Nasi* had been denigrated. This legerdemain, I felt, was not possible for any one but a member of the Qalammas clan which we have already discussed in connection with the one weak and fragile link in the cultural chain binding the Arab tribes into a people.

37. What seems to have happened is this : The Second Khalifah, beset with the problem of reconciling (a) the actual existence and (b) the desired non-existence of the *Nasi* in the very first decade of the Muslim era, initiated in his regime and, finding it imperative to restore some order and sequence in the accumulating chaos of months and years, had commandeered the services of a member of the

asked, 'What do you mean by dates ?' The man explained that the Khusros of Iran, on their letters and Farmans inscribed the date, the month and the year in which they were issued. 'Umar said, "This is a good system."

(Daily Nayid -e Deccan, 1st Jan. 1977)

31. These quotations I give only as brief illustrations. But references are many to the fact that it was in about the fourth year of the Second Khalifah's regime that some serious attention was paid to the setting in order of the Muslim calendar.

32. But a perusal of many such references like those given above leaves one with a peculiar frustration. They, so to say, beat about the bush, but evade, the crucial questions. For example, we have had to infer from the dates given by William Muir how the *Nasi* was overlooked and ceased to be intercalated during the regime of the First Caliph. But nowhere in this book or elsewhere is it specifically mentioned that it was during this regime that the *Nasi* ceased to be intercalated. Coming to the regime of the Second Caliph, we are often shown that some chronological problems were taken notice of; their solutions had become imperative; they were attended to during his regime. But, when you try to see what these problems really were and what solutions had been adopted, there are just no such details available. All that we are told, over and over again, is that the point of the Hijrah was fixed as the beginning of the Muslim Era. But this was the least complicated of the problems; the old Arab year, from time immemorial, had begun with the new-moon of *Muharram*. To add to this, the Hijrah from Mecca, as we have already shown, had taken place, almost as if it had been timed by the Prophet himself to herald both a new year and a new era commencing with the new moon of that month. It must, therefore, be concluded that fixation of the Muslim calendar, as an achievement of the Second Khalifah involved other adjustments beside the point of time from which the Muslim Era was to commence.

D. The Emerging Thesis

33. The question of questions that canfronts us is : What happened to the three months of *Nasi* that had actually intervened during the first ten years of the new *Hijrah* era ? By what calendrical device did they become non-existent ? The cessation of intercalation during the regime of the First Khalifah had **eliminated** the *Nasi* from the

C. The Second Khalifah

28. Weir's revised version of Muir's *The Caliphate*, which we have been following, devotes sixteen chapters, covering 112 pages, to the regime of 'Umar, the Second Khalifah. Whether the dates or the sequence of events during these 10 years and 3 months (August 634 to November 644) were any more reliable than those of Abu Bakr's regime is not mentioned. The only reference of chronological significance is the following brief passage and its footnote :

"To Umar is popularly ascribed ... the regulation of the Arabian year. He introduced for this purpose the Mohammadan Era, commencing with the new moon of the first month (Moharram) of the year in which the Prophet fled from Mecca. Hence the Mohammdan era was named the *Hijra*, sometimes written *Hegira*, or "Era of the Flight" 1 (ibid p. 181)

29. M. Hamidullah, in an article contributed in 1968 to a Pakistani journal,† provides the following corroboration :

"The calendar reform dates from the lifetime of the Prophet, yet the adoption of the *Hijrah*, as the point of the beginning of the Muslim era, dates from the Caliphate of 'Umar, some six years after the death of the Prophet. According to our sources, (Ṭabari, Sakhawi, Ibn al Jawzi, Ibn 'Asākir) it was the governor of Basrah, Abū Mūsā al-Ash'ari, who first felt the need of citing the year along with the date and the month in State documents; a certain Yemenite explained the practice in his country; 'Ali suggested the adoption of the *Hijrah* as the starting point; it was 'Uthman whose suggestion prevailed that Muharram should continue to be the first month, and not *Rabi' al awwal* in which the Prophet had reached Medina."

30. A more recent article in Urdu by one Mowlana Sa'īd al A'ẓamī of Hydrabad repeats the same information still more elaborately :

(a) "Abu Musa, in a letter to the Second Khalifah, asked why it was that no date was mentioned in the communications received from him.

(b) "Maimun bin Mehran reports that a payment order was received by the Amir al-Mu'minin on which the date mentioned only the month Sha'ban. He asked, "Which Sha'ban ? the current Sha'ban ? the preceding Sha'ban ? or the coming Sha'ban ?"

(c) "Muhammad bin Miran reports that a man asked the Khalifah 'Umar to specify dates on his instructions. 'Umar

24. In any case it is said to have become obvious to the Caliph that Islam had to be prepared in advance for the recurrence of such situations. So, Abu Bakr organised,

> "eleven independent columns, and over each appointed a distinguished leader ... Arabia was parcelled out and each detachment given a quarter to reclaim with marching orders—where to begin and what course to take ... By this great scheme, in course of time, no spot would be left unconquered. ... " (ibid p. 16)

25. Changed circumstances had apparently effected a metamorphosis of Islam. In contrast to the peaceful occupation of the Arab citadel of Mecca only four years earlier, the Muslim armies were, henceforth, to spread far and wide expanding the glory of a conquering creed to the ends of the earth.

26. But time moves on oblivious of human struggle with an ever-changing situation. Another twelve moon-months passed by and another Ḥajj is said to have assembled in February (15th ?) 634. Comming only 11 days earlier in the season each year, the moon month was still (the old) *Rajab*. The emergent situation had apparently relaxed somewhat. So the Caliph attended this Hajj in a season which had become appreciably cooler than it had been until the Farewell Pilgrimage of 8th March 632. Thanks to the elimination of the adjusting *Nasi*, it would thus continue to change its climatological nature around the seasons; one year it would expose the bare-headed pilgrims to the intense heat of the desert sun†; during another year their bodies, covered with nothing more than two pieces of unsewn cloths, would shiver in the bitter winds of the desert nights. During still another year a large proportion of the animals, led to Mecca for the great sacrifice, would consist of mothers bearing their unborn young.

27. Abu Bakr passed away on the 23rd of August 634. But it was in this brief interlude of just a little more than two years that an anomalous cultural pattern had infiltrated into the socio-economic life of Islam. It appears that the Prophet of Islam had hoped and planned to advance the calendar of his people from the inefficient but adjusted lunar to the pragmatic and progressive solar reckoning. His sudden demise, the chaos that followed and, apparently, the earnest zeal of his followers to carry out what they thought to be his wishes to the last letter, had retrogressed it from a 'lunar' not to a solar but to a 'pseudo-lunar' reckoning.

"The Arabs were on all sides rising in rebellion. Apostasy and disaffection raised their heads. Christians and Jews began to stretch out their necks; and the faithful were as a flock of sheep without a shepherd; their Prophet gone, their numbers few, their foes a multitude...(p. 11)

"The Collectors of tithe (an impost hateful to the Bedouin), the Legates and the Residents of Mohammad throughout the Provinces,—all, in fact, who represented the authority of Islam,—fled or were expelled. The Faithful, wherever found, were massacred, some of the Confessors suffering a cruel death. Mecca and Aṭ-Ṭaif wavered at first; but in the end through the strong influence of the Koreish stood firm...'Amr, returning from Oman, reported that the whole of central Arabia was in open apostasy or ready to break away on the first demand of tithe ... his report filled the citizens of Medina with dismay ... " (ibid p. 12)

"A deputation offered to hold by Islam and its ritual, if only they were excused the tithe ... But the Caliph indignantly rejected the offer ... 'If you withhold but a tether of a tithed camel, I will fight you for it', said the Caliph." (ibid p. 13)

20. It is reported that some of the Bedouin around Medina actually attacked the town but strong defences had been set up so that they dispersed in discomfiture. This little victory turned the tide and the immediate danger was passed over.

21. But the basis of this revolt the earlier-than-usual arrival of the New Year and the consequent inability of the people to pay tithe, before harvest, went unnoticed, or at least unrecorded.

22. On the very next page we read :

"Soon afterwards, the spirits of the Muslims rose as they saw some chiefs appear bringing in the tithes. The tribes whom they represented were indeed few compared to the apostate hordes, but it was an augury for brighter days ... " (ibid p. 14)

23. What is not recorded is that this delayed but voluntary submission was perhaps due to the arrival of the proper season and the consequent facility for payment of the seasonal tithes. Instead, what is recorded is as follows :

"It was the simple faith of Abu Bakr which fitted him for the task, and made him carry out the law of his Master to the letter ... " (ibid p. 14)

17. The plight of the trading communities of the towns, including the *Quraish*, was even worse; their very economic existence depended upon the close synchronization of their trade cycles with the cycles of the seasons. Their trade agreements, the *ilāf*, (Sūra *Quraish*, 106 : 2) would have to be fulfilled a month earlier than anticipated. The protection from violence guaranteed to their caravans could be counted upon only a month later; would not their trade be exposed to ravage in the intervening month ? The timing of the Winter Caravan, the *riḥlāt ash-shitā'*, became a matter of concern. The *Ḥajj al Akbar* had not assembled in August 632; presumably, the subsequent pre-winter setting out of the caravan to the south would also have to be cancelled; when goods from the north had not been exchanged in August, what would be available for being transported to the south in the November that would follow ?

18. At the beginning of yesterday's lecture it had been shown that the adjusting *Nasi* had served as the king-bolt that had kept together and co-ordinated the functioning of the other four cultural patterns of the pagan Arabs. In spite of the far-reaching reforms in the ideology of the people, in spite of the change over from idolatory to the worship of the One and the Only Allah, this king-bolt had continued to function and to retain the identity of the Arabs as a people even during the Medinan decade of the Prophet's mission. With the removal of this king-bolt, the adjusting and co-ordinating *Nasi*, within two months of the Prophet's demise, the old Arab culture fell apart into pieces. The reaction to religious reform, so adroitly controlled by the Prophet even till the end of his mission, suddenly gave place to accelerating anarchy and chaos. Along with the *Nasi* the other four co-ordinating cogwheels grinded to a halt. When the Second Khalifah took over the leadership of the orphaned Ummah, the Minor and Major Assemblies of Spring and Autumn, the trade caravans of winter and summer, the four sacred months and the trade covenants with the tribes of the north and the south had all become well-nigh obsolete.

19. What we have noted above are only logical conclusions drawn from the significance of the occurrence of the first post-Prophet Ḥajj having become due in the month of February 633. Let us see what Muir/Weir's account, which is so conspicuously silent with regard to any mention of the change over from the adjusted to the unadjusted moon-calendar, has to report between the lines on these developments during the regime of the first successor of the Prophet.

away in June 632, corresponding to *Shawwal* of the old Downstream calendar. Normally, therefore, the first of the three sacred months, *Dhu'l Qa'd*, should have commenced within a month of the Prophet's demise. Preparations for embarking on the Ḥajj that would follow should have commenced in Medina in this month of *Dhu'l Qa'd*. The Ḥajj itself would assemble at Mecca in the subsequent month of *Dhu'l Ḥajj* i.e. August 632. But the above reference to a six months later date, February 633, as the date of the very first post-Prophet Ḥajj, is a clear indication of the fact that owing **either** to the earlier annoucement by Abu Bakr at the August 631 Ḥajj (*Surah Bara'h* 9 : 1-10), **or** to the confusion that followed the demise of the Prophet in June 632, **or** to the combination of both these factors,

either (a) No Ḥajj had assembled in Mecca in August 632,

or (b) No notice of that Ḥajj had been taken in Medina.

14. On the other hand, if this major Ḥajj **had** assembled in August 632, that would have been the third year after the preceding intercalation of the *Nasi*, and the question of whether or not another *Nasi* was to be intercalated immediately after that *Dhu'l Ḥajj* would have had to be faced squarely. The fact that that Ḥajj, for one reason or another, had failed to assemble obviously eliminated any chances of the Qalammas to announce the intercalation. Consequently, THE MOON-MONTH THAT FOLLOWED THE DHU'L HAJJ WAS NOT THE INTERCALARY MONTH OF NASI BUT MUHARRAM—THE FIRST MONTH OF THE NEXT YEAR !

15. This omission of the *Nasi*, even in the third year after its preceding occurrence, brought in the NEW-YEAR moon of Muharram on 23rd August, that is, more than a month prior to the Autumn Equinox. This had not happened in Arab memory; or at least not in the memory of the then living generation. Even the Bedouin, scattered in the rocky hills and sandy plains, could not have failed to notice this earlier than usual commencement of the New Year. The cycle of their sheep and camel breeding would have to be expedited, if the *'ushr*, or the tithed animals were to be handed in as one-tenth of the year's produce.

16. But the classes of people for whom this acceleration or advance of the New Year Moon was more disconcerting were the people of the oases who grew wheat and barley and paid their *'ushr* after having harvested their crops. How could they pay these tithes in kind before their crops were harvested ?

the Qur'an itself, "the second of the two," (Sūrah *Barā'ah*, 9 : 40), in the historic Mecca-Medina journey, ten years earlier. Within a week of the Prophet's demise he took over charge of the Ummah with but one aim : **to carry out to the last letter what he believed to be the wishes of Allah and His Messenger.** Let us now see how the *Nasi*, denigrated so recently, was dealt with during his brief regime of two and a half years.

11. In the slightly condensed version of William Muir's **The Caliphate**, Weir devotes the eleven opening chapters, altogether covering 80 pages, to Abu Bakr's brief regime as Khalifah. In this narrative of events he gives more than 25 seasonal dates of the Julian calendar as milestones to earmark the chronological sequence of events. But the contents of all these eleven chapters are governed by the following passage which he ends almost apologetically :

> "...tradition, upto the Prophet's death clear and copious, now suddenly becomes curt, obscure and disconnected. The scene of confusion that prevailed throughout the land, presents itself to us in meagre, dim and hazy outline. With Islam struggling thus for very life, its followers thought at the moment only of the lance and the sword; and when the struggle was at last over, little remained but the sense of escape from a terrible danger. **No dates are given for the many battles fought throughout the year** (that followed the demise of the Prophet). We can only guess at the sequence of events. .".
>
> (p. 83; emphasis added)

12. This last admission makes most of the above-mentioned 25 or more seasonal dates into merely reasonable conjectures which cannot be accepted as altogether reliable. Four of them, however, divide the 27 months of this regime into three distinct periods; they cannot be far wrong and do throw much light on the events of this fateful interlude :

1. 10th June 632 Abu Bakr takes charge
2. (26?) Feb. 633 Not able to attend Ḥajj
3. (15?) Feb. 634 Attends Ḥajj
4. 23rd Aug. 634 Abu Bakr passes away.

(1–2) Period A 9 months
(2–3) Period B 12 ,,
(3–4) Period C 6 ,,

13. The second of the above four dates, earmarking the first post-Prophet Ḥajj of February 633 is the most significant of all, particularly for our chronological analysis, and provides the following important conclusions : The Prophet, as we have seen, passed

the adjusted moon-calendar could be easily replaced by an entirely different and unfamiliar reckoning in which the waxing and the waning of the desert moon had no meaning ?

5. Both commonsense and historical evidence would suggest that such a far reaching change would certainly have been too dislocating, too sudden and too premature. Would the Prophet have plunged into such a venture if he had known that he was so close to the end of his mission ?

6. One is, therefore, bound to conclude that the two announcements embodied in the Qur'an, first, the closing of the August Ḥajj to the incorrigible *a'rāb* (Sūrah *Barā'ah* 9 : 1-10); second, the denigration of the *Nasi* as the source of confusion (ibid 9 : 37), both constituted observations rather than injunctions.

7. It must also be remembered that, even if the first of these two passages had announced the closure of the Sanctuary to those who indulged in obscene practices during the Ḥajj, that announcement had not abolished the August assemblage itself. If the second of these two passages denigrated the *Nasi* as the source of confusion, (and, indirectly condemned the moon calendar in which such adjustment was indispensable) it had not *enjoined* the elimination of the *Nasi* as an isolated move. It had not enjoined even a premature adoption of the solar reckoning before the ground had been prepared for introducing what already prevailed in Iran and in Byzantium. Both passages, it must be inferred, were apparently the initial and indirect observations to provide Qur'anic sanctions to facilitate the replacement of the lunar by the solar calendar if and when the time was ripe for such a great step forward in the race of civilization.

8. Despite the justification of the above statements, one cannot forget that the condemnation of the *Nasi* even as an observation, was itself a bold initiative. If death had not intervened, if the need for intercalation had not so tragically coincided with the ensuing chaos, that Qur'anic sanction could have led to the eventual adoption of the changeover from the moon to the sun reckoning.

9. With this brief synopsis let us proceed to the post-Prophet period of the Caliphate.

B. The First Khalīfah

10. The faithful Abu Bakr was one of the earliest to believe in the Divine mission entrusted to the Prophet. He was, as mentioned in

LECTURE III

After The Prophet

A. Recapitulation

1. We ended yesterday's lecture at the demise of the Prophet when "it must have seemed that the sun had set for ever...". The nascent Muslim community found itself in sudden darkness and beset with many difficult problems.

هوا مخالف ، شب تار ، بحر طوفان خیز　　گسستہ لنگر کشتی ، ناخدا خفتہ است

Let us, at this crucial stage of our narrative, take some fresh bearings to understand in better perspective the place of the *Nasi* in the basically changed situation.

2. Calendrical adjustment is a subject with which few people are ever familiar. Mecca had only the one family of Qalammas that had retained its power and privilege by keeping this knowledge to its own elders. They alone had, from time immemorial, virtually dictated when the adjusting month of *Nasi* needed to be intercalated in order to keep the moon-months abreast with the seasons of the terrestrial year. The rest of the Arabs of town or country had little idea of why the *Nasi* was an indispensable feature of any moon-reckoning, and why it could not be abandoned without alternative calendrical provisions.

3. Eliminating the *Nasi* was deceptively easy : to cope with the consequences of such elimination was far, far more, difficult and complicated a procedure. It had required the determination and the power of a Julius Caesar, backed by the administration of a Roman Empire, to replace the inefficient but age-old moon-reckoning by a solar calendar which served the purpose of time-recording infinitely better.

4. Was it to be expected that, with the diffused, primitive cultural base, such as that which existed in the Hijaz of the seventh century,

9	4 Mar. 627	Sha'bān 5 8th	Dhu'l Qa'd 5 11th	Khandaq	3
10	20 Aug. ,,	*NASI*	Rab. II 4th		
11	13 Mar. 628	Rajab 6 7th	Dhu'l Qa'd 6 11th	Ḥudaibiyah	4
12	2 Mar. 629	Rajab 6 7th	Dhu'l Qa'd 7 11th	'Umratu'l Qaḍa	4
13	27 Aug. ,,	*NASI*	Jam. I 7 5th		
14	2 May 630	Ramaḍān 8 9th	Ṣafar 9 2nd	Submission of Mecca	5
15	5 Aug. 631	Dhu'l Ḥajj 9 12th	Jam. I 10 5th	Ḥajj Abu Bakr	5
16	31 Dec. 631	Jam. I 10 5th	Shawwāl 10 10th	Death of Ibrahim	5
17	18 Feb. 632	Rajab 10 7th	Dhu'l Ḥajj 10 12th	Ḥajjatu'l Widā'	5
18	27 May 632	Shawwāl 10 10th	Rab. I 11 3rd	Wafāt : June 8, 632	5
	15 July 632	*NASI*	Jam. I 11 5th	Abandoned	

Placement of Events in the Medinan Decade According to Three Different Calendars

Serial No.	Julian Date of New Moon	Downstream Calendar	Upstream Calendar	Events	Diff. in Mon.
1	2	3	4	5	6
		A.H.	A.H.		
1	16 July 622	Dhu'l Qa'd —2 11th	Muḥarram 1 1st	Upstream Muḥarram	2
2	15 Aug. ,,	Dhu'l Ḥajj —1 12th	Ṣafar 1 2nd	2nd Pledge/Exodns	2
3	13 Sep. ,,	Muḥarram 1 1st	Rab. I 1 3rd	Entry into Medina	2
4	4 Aug. 623	Dhu'l Ḥajj 1 12th	Ṣafar 2 2nd	'Ali-Fātimah m.	2
5	15 Feb. 624	Jam. II 2 6th	Sha'bān 2 8th	Change of Qiblah	2
6	25 Apr. ,,	Ramaḍān 2 9th	Dhu'l Qa'd 2 11th	Badr	2
7	22 Aug. ,,	*NASI*	Rab. I 3rd		
8	23 June 625	Shawwāl 3 10th	Muḥarram 4 1st	Uḥad	3

of the Zodiac? Must they be taken to mean only the twelve revolutions of the moon around the earth—a duration which falls eleven days short of the terrestrial year and has very little to do with controlling the earthly life of plants, animals and human beings?†

42. This is at least one question which posterity is likely to ask over and over again. But, all that can be said at this stage of our present analysis is that this Farewell Pilgrimage left so deep an impression on the minds of the Muslims of those days, and the condemnation of the *Nasi*, as a recurrent source of confusion, constituted such a palpable relief to those who had experienced the recurrent dislocation it was wont to cause, that its elimination became a religious mission—at least to those who found themselves entrusted with power and responsibility after the demise of the Prophet.

43. Did they realize that the elimination of the *Nasi* by itself, and without the adoption of the alternative means of recording the terrestrial year correctly, was bound to land them from confusion into chaos?

44. Obviously they did not. But how many of us, placed in the circumstances in which they found themselves, would have done so? Apparently, all that their zeal made incumbent on them was to see that this *Nasi*, condemned by the word of God, was eliminated at any cost, at least as a duty owed to their deceased Mentor's farewell message. Arab loyalty apparently demanded that elimination, made it incumbent on them. How this elimination, and later its effacement was achieved, we shall try to explain in tomorrow's lecture.

45. What we have to emphasize at the end of this second lecture is that, within three months of this Farewell Pilgrimage, the Prophet suddenly fell ill; before 13 days had passed, the Muslim Ummah was orphaned on the 8th of June 632 of the Julian Calendar.

It must have seemed as if the sun had set for ever. They must have been reminded of the verse in Sūra *Mu'min*, (40 : 34) where, referring to the passing away of *Yūsuf*, the Qur'an says :

> "...and then you said, "Allah will never send another Messenger again...".

38. Ladies and gentlemen, I wish I had the time, and the occasion permitted me, to recount more of what was said. Even then I could not possibly have conveyed to you the emotional fervour that must have arisen to unimaginable heights. There are many accounts of all the lessons from the Qur'ān, and from his own life and experience of the past twenty years, to which he drew the attention of the gathering; but it was the emotional tone of this assemblage which left an unforgettable impression on the Muslim memory.

39. Some affirm that (except for the intervening parenthetical passage) the *Nasi* verses (Sura *Barā'ah* 9 : 36-7) were revealed in the course of this oration. Others are inclined to believe that several other utterances having the weight of revelations, and incorporated in the Qur'ān as independent passages which do not connect with the preceding and subsequent text, are also passages revealed on this occasion. For example, one such passage is,

> "O thou, (My Messenger !) Proclaim (anon) the message which has (now) been sent to thee from thy Lord. IF THOU DOST NOT, THOU WOULDST NOT HAVE THEN FULFILLED THY DUTY ! (Emphasis added) Allah will protect thee from the wrath of men. Verily He guideth not a people who obstruct !"
>
> (Sūra *Mā'ida* 5 : 63)

Another passage which is, perhaps, a corollary to the above is :

> "This day have I perfected for you your faith; brimmed you with my blessings; your creed Islam I have decreed !"
>
> (Sūra *Mā'ida*, 5 : 3)

40. In *Hadith* literature, a saying of the Prophet, attributed to this occasion reads as follows :

> "Verily, this day Time has made a full cycle and returned to the point at which Allah created the heavens and the earth."

41. Of course, every Muslim is inclined to, and has the right to, interpret such legacies in the light of his own background of knowledge and experience. One might, however, be permitted to suggest that, in view of the importance of the *Nasi* verses to the past and the future of Islam, both the Qur'ān and the *Hadith* literature need to be combed again for ascertaining whether they can possibly mean something other than what they have been understood to mean. For example, CAN the emphasis on 'the TWELVE MONTHS prevalent ever since He created the HEAVENS AND THE EARTH' be taken to refer to the 'twelve sections of the year' corresponding to the Twelve signs

This proclamation guaranteed protection to all pilgrims assembled at that Ḥajj; it allowed even the pagans to roam about at will and to perform their pagan ceremonies during the current three Sacred Months—provided only that they did not indulge in mischief or create disturbance. On the other hand, this same announcement absolved Allah and His Messenger from providing similar protection during the Assemblages that would follow in the years to come. This virtually closed the doors to all those who would persist in the old and often barbarous and obscene ritual. This, it was hoped, would enable the law-abiding and assimilable pagans to be gradually brought into the fold of the Muslims—the submissively righteous among mankind.

35. This Ḥajj of 15th August, 631 was followed less than five months later by a tragic event which could not but have affected the human emotions of the aging Prophet. His infant son, Ibrahim, had been born to his Christian wife Maryam, only 18 months earlier. Suddenly, this infant passed away on Monday, 27th January, 632. Astronomical records still confirm the fact that this day had witnessed a conspicuous eclipse of the sun in that region. But from that striking coincidence he refused to draw any supernatural conclusions. This was the end of *Jamādi al-awwal* (downstream). Only the moon month of *Jamādi al ākhir* intervened between that date and the New Moon of *Rajab* the month in which was to be performed the long looked for *Ḥajj al Islam*. He continued to prepare himself and his righteous band of followers for this minor Ḥajj that was, perhaps, to be his last. Perhaps, he hoped that it would henceforth become the one and only annual assemblage heralding the New Year.

I. The Farewell Pilgrimage

36. The Prophet was right. This *Ḥajj* constituted the zenith of the Islamic teaching: it left its indelible stamp on the history of this great Message.

37. It is estimated that more than a hundred thousand people had assembled from among the tribes and regions of Mecca and Medina, places which were 200 miles apart. After completing the rites of the Pilgrimage, the Prophet addressed the multitude from the Hill of *'Arafāt*.

> "O ye people! Harken to my words, for I know not whether, after this year, I shall ever be amongst you again..."

Caesar. In comparison with the solar reckonings of neighbouring Iran and Byzantium even this adjusted lunar reckoning had become well-nigh obsolete. The uncertainty in the appearance of the New Moon over and over again led to disputes about the commencement of the Ten Nights of *Dhu'l Ḥajj* (Sūra *Fajr* 89 : 1-10). The commencement of the fasts of *Ramaḍān* was another recurrent occasion for uncertainty. Worse still, the choice left to the Qalammas in announcing the intercalation of the *Nasi*—either between the Sacred Months of *Dhu'l Ḥajj* and *Muḥarram*, or after the end of the Four Sacred Months—tended to cast doubts every two or three years when the *Nasi* had to be intercalated. Would not the abandonment of the moon altogether, and the adoption of the solar reckoning eliminate once for all these multiple problems in the annual cycle of life? Would this not lighten the shoulders of the expanding community of the righteous? Was not this community of the righteous destined to incorporate all mankind?

32. It was these contemplations that apparently revolved in the mind of the Prophet, and the happenings of the remaining two years only confirm the vital decision he arrived at and the actions he both planned and initiated.

33. The *Ḥajj al-Akbar* that assembled in August 630 came only two months after Mecca accepted Islam; naturally, it brought together both Muslim and pagan pilgrims; naturally, there was much confusion and at least some friction in the performance of the ritual by the pagans and the Muslims. That *Ḥajj* was later designated as the *Ḥajj al makhlūṭ* or 'the mixed *Ḥajj*'. The major and minor incidents of this occasion too must have led to much thinking of some alternative possibilities, during the next twelve months.

H. *Ḥajj* Abu Bakr

34. So, when the next *Ḥajj al Akbar* came round in August, 631, the Prophet's trusted companion, Abu Bakr, headed the caravan from Medina to make an important announcement in the large and still mixed gathering which was to assemble in Mecca. Soon afterwards the younger and intrepid 'Alī was despatched to buttress his older colleague. The announcement made on this occasion is clearly recorded in the opening verses of Sura 9, *Barā'ah* (vv. 1-9), which is generally accepted as chronologically the last Sūra of the Qur'ān.

G. New Vistas, New Horizons

30. He was now 60 years old and had to expedite the great reforms that he had dreamed of in his helplessness over the past two decades. With the changed circumstances he realized that the proper organization of the enlarged finances of the community had become imperative for its very existence. The ad hoc voluntary contributions, the *ṣadaqāt* according to individual inclinations and timely persuasions, would not suffice any longer. The levies on the trade in different markets, on the produce of land and livestock, the offerings collected in the *Baitullah*, all these incomes, so far collected by the heads of different tribes and hereditary functionaries, had to be co-ordinated and effectively enforced. There had to be a central treasury, a *Bait ul māl*, under the custody of a trusted authority. Different rates had to be fixed for different types of levy. The *'Ushr* or tithe (a tenth) was the age-old rate of levy on the produce of land and livestock; the *zakāt*, presumably, the one-fortieth (2½%) of the value of sales, on different articles of trade; the *khums*, i.e. one-fifth (20%) on unearned or fortuitous acquisition, all these had to become obligatory. Some accounts suggest that levies on trade "differed according to whether the merchant was a citizen, a resident-alien or a foreigner, and they paid 2½%, 5% or 10% respectively." Very soon, the enforcements of these regulations, under the supervision of the faithful Bilal, began to attract not only money but also sheep and camels, date-fruit and other products of the seasonal harvests. The functions and the functionaries of the *Bait ul māl* expanded and had to be organized with such efficiency as had never been needed before.

31. This prime need of enforcing order and efficiency in the life of the expanding Muslim community necessitated, more than ever before, the need of further tightening up of the annual cycle of tribal life and a still closer synchronization of the economic order with the seasons of the terrestrial year. He had for long realized that Mecca and its two assemblages of August and March (*Dhu'l Ḥajj* and *Rajab*) were the nucleuses of Arab life and culture. He had to build the arch of Islam on these two, or perhaps a beacon on only one of these assemblages, so that the teaching of the Islamic way of life may spread far and wide and still move around a single focal centre of both space and time. The adjusted lunar reckoning of the year had continued to be operative in both Mecca and Medina for more than 600 years *even after* the adoption of the solar reckoning by Julius

city in June, 630. We have just seen how the Meccan antagonism had been softened in March, 628; how the peaceful performance of the Minor Ḥajj in March, 629 had inclined the Quraish to accept the moral supremacy of the Prophet and the suitability of the Muslims to serve as the leaders of the Arabs. Perhaps, they even missed the presence of the Muslims in the next *Ḥajj al-Aṣghar* in March, 630. Perhaps, their aggression against a tribe which had been guaranteed protection by the Muslims, was itself a subtle invitation to the Prophet to return and take up the reins of Meccan affairs which had been deteriorating. In any case, their default with regard to the treaty entered into with the Prophet, could not be overlooked; a large expedition started from Medina and reached the holy city in *Ramaḍan*, May-June of 630. The Quraish submitted unconditionally. The grace and magnanimity of Allah's Messenger to this submission provided a righteous example of clemency unequalled in the history of political combat or the annals of religious confrontation.

28. I cannot help quoting here a passage from *The Life of Mohammed*, compiled from various sources, by my late and revered teacher, Mirza Abul Fazl :

> "The once haughty chiefs of the Koreish appeared with abject countenances before the man they had persecuted so virulently only yesterday, for now their lives were in his power.
> "Descendants of the Koreish ! how do you think I should act towards you ?" demanded Mohammed. "With kindness and pity, gracious brother and nephew !" replied they with one voice.
> At these words, says the Chronicler, Mohammed burst into tears, and repeated a verse from the Koran recounting how Joseph had forgiven his brothers : "Yes, I will not reproach you this day : Allah will pardon you ! Verily, He is the most Merciful of the Mercifuls."
>
> (Sura *Yūsuf*, 12 : 92)

29. This submission added temporal supremacy over the Arabs to the moral and spiritual eminence which the Prophet and his followers had already achieved. Islam was now firmly established, thousands flocked to Mecca to pledge their allegiance to him and his righteous creed. But, faithful to the *Anṣar* of Medina, who had so loyally befriended him in his hour of Meccan rejection, he returned with them to Medina.

of violently denying this principle, the Quraish had come so far as to cease reacting adversely to it. They did not defiantly reject it; in time, this silence would mean acceptance; in time, acceptance would be transformed into conviction. This is apparently how the Prophet's inspired mind generally worked.

24. Immediately, Ḥudaibiyah opened up fresh vistas; he began to entertain hopes of wide acceptance, even increasing and smooth spread of the Divine message to realms beyond Arabia. Invitations were sent to the Heads of neighbouring tribes who had not till then entered into compacts of righteous solidarity. Unassuming 'Envoys' of the unpretentious Prophet were despatched even to the Heads of neighbouring religious Communities and political States inviting them to participate in a vast and glorious venture to establish a universal Faith.

25. For our particular purpose, however, what we need to remind ourselves is that this compromise-cum-victory had been achieved during the One Sacred Month of *Rajab* corresponding, year after year, and more or less closely, with (a) the *Vernal Equinox* of our solar system (b) the *Passover* of the Jews, (c) the *Easter* of the Christians, and (d) the *Now Roz* of Iran.

26. A year later, thanks to the Quraish having honoured their word, and the peaceful performance of the *Ḥajj al-Aṣghar* by the Muslims, the prestige of the *Rajab* gathering was enhanced. The Muslims too, left to perform the rites in their own way, found themselves closer to this Minor assemblage of March than to the Major Ḥajj of August. The latter occasion, as we have seen, was dominated by pagan ceremonies—some of which the Muslims regarded as uncouth and even obscene. On the contrary, this minor Ḥajj—which later came to be known as the *'Umrat al-Qaḍa*, or the postponed pilgrimage, had provided them the hope that the *Ḥajj al-Aṣghar* might itself become the major assemblage of Islam. Perhaps it even occurred to some of them that the August Ḥajj coming in the last month of the Arab year, was often followed by the adjusting month of *Nasi* which so often led to misunderstanding and unnecessary strife : obviously, *Rajab* would also have the advantage of being free of such aftermaths.

F. Submission of Mecca

27. Once again we shall pass over the intervening causes that led to the Medinan expedition to Mecca and the peaceful submission of that

the large crowds. Obviously, the March assemblage at the time of the *Ḥajj al-Aṣghar* was a safer and better choice.

20. So, virtually unarmed and only as peaceful pilgrims, he decided to approach Mecca. Presumably, on the appearance of the new moon of the Sacred Month of *Rajab*, the band of Muslims, led by the Prophet himself, embarked from Medina. Most of those who had participated in the Exodus from Mecca were with him. Presumably, those of Medina who had then brought him away from Mecca as their guest were also there.

21. The parleys that had taken place on the outskirts of Mecca, this is not the occasion to ıelate or to analyse. For our present purpose all that needs to be mentioned is that a compromise was reached. The Quraish of Mecca, declined to suffer what seemed to be a gate-crashing at such short notice; but they could not bluntly rufuse; they promised to let the Medinan pilgrims perform the *Minor Ḥajj* next year if they went back peacefully this time. Being a relatively less important occasion, they would, in March next year, themselves resort to the hillsides of Mecca so that there may be neither close contact nor occasion for friction. Left to themselves, the Medinans too would have the opportunity to perform the rites of the *Minor Ḥajj* in their own way.

22. Naturally, there was some disappointment among those who, despite long confrontation, expected warmer response from their erstwhile neighbours and relatives. But the caution and foresight of the Prophet softened the apparent rebuff and converted it into what was in reality a victory for the sagacious. The Qur'ān itself proclaimed :

Inna fataḥnā laka fathan mubīnā

Lo! We have made thee victor in a glaring victory !

(Sura *Fataḥ* 48 : 1)

23. The status of Islam and that of the Muslims rose overnight. From being a negligible band of remonstrators ('protestants' if you like to call them) who deserved to be crushed, they became both a religious and a political entity with whom even the Quraish of Mecca had entered into a mutually esteemed treaty. From now on religious confrontation would be replaced by sociological adjustment. The basic and unbending principle of the Oneness of the Creator and, consequently, the Oneness of Mankind, was to be left undisputed. Instead

While going down column 5 I'd like you to notice also the events which it records and particularly item 11 designated as Ḥudaibiyah which is placed in

March according to the Julian calendar,
Rajab according to the Downstream calendar, and
Dhul Ḥajj according to the Upstream calendar.

The significance of this increase will be explained later. For the present let us examine the significance of the event known as the *Ṣulḥ*, or "Peace Treaty" of Hudaibiyah.

E. Ḥudaibiyah and After

17. The compromise arrived at between the Muslims and the Quraish of Mecca at Ḥudaibiyah stands out as another distinct milestone in the history of early Islam. The frustrating persecution of the Meccan period, extending over thirteen years, is over; the subsequent five years in Medina, with their disillusionment with the Jews, massive confrontation with the Quraish of Mecca, the self-identification of the Muslim community, all these had led to a group-yearning to visit Mecca, the city of their birth and childhood. The Prophet too began to look towards Mecca, with the aim and the hope of establishing some sort of rapproachment with the Quraish, his antagonized kinsmen and the people from whom he and his little band of seekers after righteousness had been virtually excommunicated.

18. But, above all, he had to be cautious. During eight months each year, Mecca was closed to him. A visit in any but the Four Sacred Months was bound to meet with a violent reaction. The gradually subsiding antagonism would only be reactivated, Mecca-Medina relations would get a set-back. It was obvious that the *Ḥajj al-Akbar* of August, or the *Ḥajj al-Aṣghar* of March, in both of which periods violence was taboo, were the only two occasions during which some hope of detente may be expected.

19. Fain would he visit Mecca during the *Ḥajj al-Akbar* in August the very event of the year after which he had left his city with his band of believers only five years earlier. But the *Major Ḥajj* would attract too large and massive a gathering. Even if he were allowed to participate in it, such participation might be dangerous. Insignificant, even negligible, frictions might start off a conflagration amidst

if that is more expressive) *on the recorded history of the* Medinan decade : (a) the old Arab calendar carried "downstream" from the past into the future; (b) the unadjusted lunar reckoning retrospectively imposed "upstream" *after the demise of the Prophet*.

16. When and why and how I think this happened will become clear in tomorrow's lecture. Today, I shall content myself by giving the ascertained solar dates of a few outstanding events along with the two lunar dates according to what 'Alavi calls the 'Meccan' and 'Medinan' calendars and which I call, respectively, the 'downstream' and the 'upstream' reckonings.

Interlude

The printed leaflet distributed in today's session (chart on pp. 34-5) will show on the calendrical placement of the more important events of the Medinan decade which we are in the process of examining in this second lecture. Please confirm on it what I now have to say.

Column 1 shows 19 events which, according to column 2, cover exactly 10 solar years. Commencing from 16th July, 622, that being the supposed date on which the Muslim era begins, the decade ends on 15th July, 632 when the adjusting *Nasi* ceased to be intercalated.

Column 3 gives the moon-months of these 19 events according to what 'Alavi calls the "*Meccan*" and I the "*Downstream*" calendar; column 4 shows the dates according to what 'Alavi calls the "*Medinan*" and I the "*Upstream*" reckoning.

In both columns 3 and 4 you will find two thin columns of figures; the first denotes the serial number of the A.H. years to which the event pertains; the second represents the sequence number of the month in the respective year.

Column 5 specifies the event itself and column 6 shows the difference between the sequence numbers of the months shown in columns 3 and 4.

At this stage I'd like you to go down the figures in column 6 and to notice how the figures increase from 2 to 3, 3 to 4 and, finally from 4 to 5. Each such increase, you will see, occurs after every month of *Nasi* that intervenes.

personal letter bearing the postal stamp dated January 26, 1972, (he, of course, dates it 9th Dhulḥijja 1391), he says :

"My opinions have naturally been in course of evolution since I first formulated them in 1935. Then I had thought that the intercalation took place regularly every third year (obviously on the basis of Perceval's hypothesis). Now in the article on *Nasi* (1968)† I hesitated...in my present stage of research, intercalations were made at the end of 3rd, 4th, 6th and 9th years of the Hijrah..."

His main difficulty still seems to be an uncertainty in the precise placement of the *Nasi* months which he admits as having been intercalated during that decade. Curiously enough, I have profited much from his findings in the several contributions he has made in periodicals and other writings; but so far I have never been able to see eye to eye with him, nor he with me !

14. The other seeker is a little-known, amateur scholar of *Ḥadīth* and *Sirah*, Isḥāq un-Nabi 'Alavī, of another erstwhile Muslim State in India, known as Rampur and now incorporated as a district of the Uttar Pradesh. His findings on the calendrical history of the Medinan decade were presented in the Urdu monthly, *Burhān* of Delhi during the half year May to December 1964. Summarized and translated into English by our friend, Dr. Abid Reza Bedar, they are available in a little volume of 48 pages. I have underscored this booklet more than any book I have ever read. 'Alavi and I have also corresponded and discussed this problem in Delhi and in Rampur. We have expressed unqualified delight and satisfaction at each other's long and honest search. I cannot say if he has learnt anything from me, but I am happy to admit that from the details of what he calls the "Meccan Calendar" I have, during my visit to Rampur in 1972, profited by accepting the autumnal equinox as the approximate commencement of the old Arab year. What I have not been able to accept is the final conclusion to which he has arrived. He believes that *two divergent calendars were concurrently prevalent among the Muslims throughout the Medinan decade*—one luni-solar adjusted by the *Nasi*, the other consisting only of twelve lunar months unadjusted to the seasons, and both having the same month-names. The first he believes, was current in Mecca the second in Medina. This theory seems to satisfy him; but, however much I might try, I find it difficult to accept this even as a remote possibility.

15. My own thesis, seemingly little but basically very different from his, is that two calendars do throw their beams of light (or shadows

> "(Remember) how He imbued you with tranquility and confidence in Him. He sent you rain from the skies so that it refreshed you, relieved you from the demon (of desert thirst), unified your hearts and strengthened your resolves..."

This Qur'ānic evidence is further supported by local records. Climatological data recorded in our own times at a mining station not far from Badr shows that even the little rain that the region receives comes in the form of a few showers in the spring season of March-April-May and again in November-December. The latter period is ruled out in this case because during winter the Meccan trade caravan went to the warmer south; the caravan which the Muslims faced at Badr was thus obviously that which was returning with merchandise from the north for disposal in the *Ḥajj al Akbar* that convened in the August-September season of the solar year. Apparently, the shower of rain mentioned in the Qur'ān was of the late spring month of May 624.

11. And yet, William Muir, Caetani and other European writers—even Shibli Nu'mani in his *Sirat un-Nabī*—all place this event five month later in December 624. Let us, therefore, try and clarify a little more the relations existing between the Julian and the local calendars.

D. Studies of Julian versus Local Calendars

12. Discrepancies, like those found in the seasonal placement of the *Bi'thah*, the *Hijrah* and Badr, continue to be found in the historical recording of most events in the Medinan decade. They have confused and confounded many scholars over more than a century since Perceval's premature annunciation. Several divergent theories have been put forward to reconcile these discrepancies, individually and collectively. But so far none has proved convincing to all concerned.

13. At least two contemporary scholars are still working on the problem. One is M. Hamidullah, my fellow citizen of Hyderabad and now associated jointly with the Sorbonne in France and the University of Istanbul in Turkey. I have been in friendly contact with him ever since I too started on this quest way back in 1944. I still have with me the daily temperature and rainfall records which he kindly maintained at my request and sent me from Ḥijāz during 1946. More recently he kindly sent me the off-prints of an article† and in a

6. The small group of genuine Muslims, those who sincerely aimed at submission to the One and Only Allah, had necessarily to be wary of these unreliable double-talkers; they had to stand firm and united, they had to build up invisible fences around their nascent community lest its roots be weakened through subterfuge and it be blown away at the first blast of a tribal hurricane.

7. These local interests were not the only danger. The vested interests in Mecca too had not forgotten that Muhammad's teaching had started to undermine their prestige and power; nor had they forgiven him for taking away some of their clients and slaves to establish a growing community in another city which might in time become a rival to their own. Fain would they conspire with the disgruntled in Medina and even with the other tribes of the region to uproot the very idea of this new-fangled, and exclusively emphasized, Allah as well as His Messenger.

8. The Prophet, on whom the righteous among both the *Muhājirīn* and the *Anṣār* depended for security and welfare, had to plan and organise both vigilance and defence. He had occasionally to take police action both internal and external.

9. The slow and steady spread and coverage of Islam during the first six years after the *Hijrah* provides remarkable proof of the Prophet's genius and the guidance he received in answer to his sincere prayers throughout this period.

C. Badr : Its Seasonal Placement

10. The Badr episode, within two years of the *Hijrah* was the first manifestation of this seemingly dormant antagonism both internal and external. Incidentally, the chronological placement of this event, like that of the *Bi'thah*, fifteen years earlier, provides us another opportunity to examine the nature and form of the needed recasting of Islamic chronology. Coincidentally, this Badr episode too occurred in the month of *Ramaḍān* which, as mentioned earlier, oscillated between the May-June period of the Julian year. Here also the Qur'ān is witness to the fact that this skirmish occurred in a particularly hot spell which was as usual, followed by a little rain that reduced the temperature and thereby revived the drooping spirits of animals and men. A reminiscence of this experience is to be found in Sura *Anfāl*, 8 : 11, where it reads :

B. Believers and Hyprocrites

3. In Medina the small group seeking freedom from persecution and opportunities of righteous endeavour, found itself torn from its native habitat and exposed to a strange environment. The bonds of brotherhood which the Prophet soon established between the residents and the immigrants did much to make the newcomers feel at home. Nonetheless, identification with a new environment takes time and there are always individuals and families who resent any intrusion of outside elements into their barricades, no matter how harmless and friendly these strangers might be.

4. One of such local elements in Medina was the Jewish community that was prominent in the region. The Prophet was most anxious to bring about mutual accommodation and even assimilation between (a) the *muhājirīn* or 'refugees' who had been virtually driven away from their homes just because they had begun to search for Divine guidance, (b) the *Anṣār*, the helpers who had given shelter and sustenance to these refugees, and (c) those who not only called themselves the *Yahūd* but also claimed to be, literally, "the Divinely Guided." At first, these "already guided" too had welcomed the Muslims in the hope that their leader, Muhammad, might be the "Prophet," promised in their own traditions. But very soon they were disillusioned. No matter how much the new Prophet was proclaimed to be the "Confirmer" and "Rejuvenator" of Judaism and Christianity, they would not accept him unless he confirmed the Judaism and Christianity not of the erstwhile pristine brand, but the Judaism and Christianity *current in Medina in their own times*.

5. Because the Prophet had gradually risen in tribal stature through his increasing number of followers there were among the pagans, the Jews, and the Christians several individuals who found their own leadership in their respective communities threatened by his teaching. Very soon these petty vested interests came to be known as the *munāfiqīn*, the foes in the garb of friends. In guise, some of them even accepted Islam; but inwardly they strove to cast out Islam from their midst :

> When face to face with the believers,
> they say, 'Believe we !'
> But when in conclave
> with their instigators
> they say, 'We are with you;
> them, we were only fooling ..
> (*Baqarah* 2 : 14)

LECTURE II

From Hijrah to Wafāt

A. Recapitulation

1. Yesterday we prefaced our recasting of Islamic chronology by defining the scope of historiology in relation to history. We then took a bird's eye view of pre-Islamic pagan culture and noted four of its cultural patterns synchronizing their year with that of the Jews and the Hindus : (a) the two assemblages of autumn and spring, known as the *Ḥajj al Akbar* and *Ḥajj al Aṣghar*, corresponding with the *Dasehra* and the *Holi* respectively, (b) the seasonal trade caravans to the north in summer and to the south in winter, (c) the four Sacred Months in which violence was taboo, and (d) the adjusting *Nasi* which made the moon-months correspond approximately with the seasons and served as a king-bolt for keeping all the four patterns in place. We emphasized that all these patterns had contributed to a fairly harmonious rhythm of life and had continued to do so throughout the life-time of the Prophet. Then we referred to the weak link in this chain and explained that this *Nasi*, generally a blessing, sometimes became a curse.

2. Next, we showed how the worship of several different tribal deities had led to cleavages, and the pulverizing of Arab tribal society. How the *Bi'thah* of the Prophet, when he had reached the mature age of forty, had made him strive against obstacles and persecution for thirteen long years until, despairing of Meccan society, he had carefully arranged for the safe exodus of his band of followers to Medina where some groups had responded to his message of righteous endeavour. The seasonal placement of these two cardinal events of early Islam—the *Bi'thah* and the *Hijrah*—gave us an idea of the nature of recasting of Islamic chronology that is called for. After this brief recapitulation, let us continue the narrative analysis of the developments in Medina and the entanglements between what we shall call the 'Downstream' and 'Upstream' calendars.

Tishri/Muḥarram corresponding to the 20th of September, 622 J. C. Finding the Jews of Yat͟hrib preparing for the fast of '*Āshūra*, the tenth day of that moon-month, he suggested to all his followers that they too should observe that fast as a gesture of goodwill towards their neighbours. All in all, it was an exodus more carefully planned and more successfully executed than the exodus of the Israelites from the land of the Pharaohs.

65. Several of you, familiar with *Sirah* literature, will find the above chronological details contrary to the traditional accounts. You will be inclined to correct me by reminding me that it was not in *Muḥarram* but in *Rabi' al Awwal* that the *Hijrah* had taken place. But at this stage of my presentation all I ask you is to please keep this contradiction in mind. Partly tomorrow, and fully in the last of these three lectures you will learn how the overlapping of *Muḥarram* and *Rabi' al Awwal* can be explained. It is this 'reconciliation,' or 'reconstruction' that constitutes the basis of my thesis.

66. Thank you for your attention. It makes me look forward to our next two meetings.

avowed obedience to his Faith by formally placing their hands beneath his as a token af allegiance. This oath of fealty later came to be known as the *First Pledge of 'Aqaba*. One of the early followers of the Prophet was sent with the pilgrims to Yathrib to guide them further in the principles and practices enjoined by the new Faith. He was to return and report when the party revisited Mecca during the next *Ḥajj al Akbar*.

61. A whole year intervened. In August 622, the day of the *Ḥajj*, the 10th of the moon-month of *Dhu'l Ḥajj*, corresponded with Friday, 23rd August. On the next day, Saturday, 24th August, late in the evening, the Prophet again met the expanded delegation from Yathrib at the same place. Having received a favourable report from his emissary to that city, the *Second Pledge of 'Aqaba* couched in the following terms was given to the Prophet :

"WE WILL RECOGNISE NONE BUT THE ONE AND ONLY ALLAH AS DESERVING OF EXCLUSIVE WORSHIP.

"WE WILL NOT STEAL NOR FORNICATE, NOR DO AWAY WITH OUR UNWANTED BABIES, NOR INDULGE IN CALUMNIES.

"WE WILL OBEY THE APOSTLE IN WHATEVER IS REASONABLE AND WE WILL BE FAITHFUL TO HIM IN WEAL AND WOE."

62. It was decided that, owing to unceasing persecution the small community of Muslims should abandon their homes in Mecca and repair to the city of Yathrib—200 miles to the north. That city was thenceforth to be known as *Madinat un-Nabi*, the Abode of the Apostle.

63. Within two or three days the moon would begin to wane, but advantage could be taken of this lantern of the sky for night travel in the still-warm nights and while the immunity from violence still prevailed over the next five or six weeks. The exodus commenced almost on the following night. During the next two weeks of *Dhu'l Ḥajj* all but the Prophet and his closest adherents had emigrated from Mecca to Medina. There is no mention of any one of them having been hindered, much less molested.

64. In the last few nights of *Dhu'l Ḥajj*, perhaps on the New Year's eve, the night preceding the 1st of *Muḥarram* (13th September, 622 J. C.), after having entrusted to 'Ali the little valuables which several poor Meccans had entrusted to the *al-Amīn* the Prophet himself departed from Mecca with one of his earliest followers, Abu Bakr, late in the evening. These two finally reached Medina on the 8th of

probably during a beauteous night when the heat of the day had been completely overcome that Muhammad experienced the glories of the night of enlightenment.

56. It is on the basis of such diverse evidence and reasonable conjectures that the Chronology of Islam has to be recast. What problems we meet in this recasting will be gradually unfolded as we proceed.

E. The Meccan Period

57. The next twelve years and three months—May 610 to September 622—constitute a saga of incessant striving, opposition, persecutions and frustrations on the one hand, and, on the other hand, the indomitable persistence of the Prophet in fulfilling the mission entrusted to him during the glorious night on a hillside close to the holy city in the valley of Mecca. In all these twelve years he could never forget the realization, the command and the commitment :

NO OTHER LORD IS THERE BUT THE LORD, NO STONE OR TREE, NO ANIMAL OR MAN DESERVES SELF-OBLITERATING REVERENCE AND OBEDIENCE. LORDSHIP IS DUE ONLY TO THE CREATOR AND SUSTAINER OF THE COSMOS AND ALL THAT LIES IN IT.

58. That *īman*—faith—combined with *'amal*—action—controlled and guided by that faith, this two-sided message the Prophet continued to preach throughout those twelve years in the magic words and passages which the Qur'ān brought to him.

59. Engrossed in their little vested interests the leaders of the Quraish could not perceive that, instead of ruining them economically as they thought it would, the acceptance of this twofold truth would have brought to them all the good which life can bestow on any people at any period of time. They ridiculed him, called him "parrot mad" (Sura *Dukhān* 44 : 14), reviled him, heckled him; their women threw dirt and rubbish over him in the streets. All that they were made to refrain from doing, at least during the four Sacred Months—the *Ashhur ul Ḥurum*—was to inflict personal injury. It was only during these periods of non-violence that he was able to convey his message year after year and even during the three years of boycott and confinement in the *Shi'b Abi Ṭalib*.

F. The Seasonal Placement of the Hijrah

60. It was during one of these *Ḥajj* periods (Aug.-Sept. 621 J. C.) that a few pilgrims from Yat͟hrib were attracted to his teaching and

man of forty had chosen a cave on a hillside for meditation *during a night of desert winter* !!!

51. Wonder of wonders, despite this glaring incongruity, and for more than a hundred years, from Perceval in 1843, and William Muir in the 1860's right down to Montgomery Watt in 1977, the European savants on Islam have expressed no doubts on the veracity of this finding. Caetani, an Italian, has cast his chronology of all Islamic history in his *Annals*† covering ten volumes on the basis of Perceval's thesis that the pagan Arabs, not aware of the astronomical basis of intercalation followed by their neighbouring Jews, had been stupid enough to go on intercalating a thirteenth month not when needed, but regularly every third year over more than two centuries ! No European scholar, at least as far as I have been able to ascertain, has even cast a doubt on this audacious assumption.

52. When renowned scholars of enlightened and science-oriented Europe could have been so credulous, what wonder that Shibli, from Victorian India, should have based his entire *Sirat un-Nabi* blindly on the findings of Perceval ?

53. And yet, it must in honesty be admitted that these European students of Islam are not the only ones who have been led astray. It is the early Muslim historians, the Ibn Ishaqs, the Waqidis, the Ibn Hishams of the early Abbaside days, who are also to be blamed for their failure to fathom this sphinx-like mystery permeating Islamic chronology even in those early days.

54. It is obvious that they worked under many limitations. The most crushing and compelling burden on them was primarily the over-riding deductive method according to which every statement had to be based on the statement of some predecessor. They were strangers to the inductive method of science in which logical and circumstantial evidence could find at least tentative acceptability. This limitation has hampered Islamic scholarship even upto our own times.

55. A simple explanation is that the *Ramaḍān*, in which the Prophet received his first revelation, had run concurrent with the Jewish month of Sivan.† In 610 J. C. this moon-month had corresponded with the period between Friday, 29th May and Sunday 27th June, when Arab summer was at its height, and resorting to a hillside was the only means of escaping from the suffocating valley in which Mecca lies with hills rising all round it.

56. The nights in Mecca, at least on the surrounding hillsides are cool and pleasant even during the hottest part of the year and it was

this vision, this realization, this enlightenment to all people—to Jews and Gentiles, Christians and Pagans, yes, to all mankind. Thenceforth, all his thoughts, all his efforts and endeavours would be governed by this one realization.

46. Where was he to begin? He rushes to his faithful partner in life Khadīja. She becomes the first Muslim; he was the first man; she became the first woman to submit her ego implicitly to the will of the Almighty, the One and the Only. Later, he is directed to invite the members of the Quraish, his own clan, and those with whom he identifies himself (Sura *An'ām* 6 : 214). He meets a mixed reaction. Some laugh at him outright. Others observe non-committal silence.

D. Seasonal Placement of the *Bi'thah*

47. This first call to Prophethood which we have just discussed is known as the *Bi'thah* and constitutes the point of take-off in the history of Islam. Let us examine it a little closely.

48. We claim that other religions belong to periods of which we know very little; that the scarcity of factual knowledge in their cases lends itself to legends and mythological hypotheses. We claim that the injunctions of Islam are corroborated both by its conformity to the laws of Nature and the records of history. We take pride in the minute details with which the life and mission of our Prophet is recorded in the *Hadīth* and *Sīrah* literature. In the light of all this, would it be impertinent or irrelevant to ask, What was the season of the year in which Muhammad was blessed with his first revelation, the exact seasonal setting of his investiture, the nature of the night during which he was, so to say, honoured with the mantle of Prophethood?

49. No one was able to enlighten me when, way back in 1944, I put this question in writing to several savants of Islam well-known all over India. None could help me. After two years of intense search I found access to an article in the Journal Asiatique of Paris† wherein a footnote to an article by Perceval published more than a hundred years ago, in 1843, offered the following information :

> "The mission of Muhammad commenced in the month of Ramadan – 23rd December 610 A. D."

50. Strange conclusion indeed! The month-name *Ramadān* signifies a period of intense heat; and yet, this month of intense heat corresponded exactly with the Winter Solstice!! Stranger still, a sagacious

phethood. Given to deep meditation, he had come to see clearly what his people needed—a Leader, an Awakener endowed with vision and foresight, tact and power of effective speech, one who would not be easily ruffled and could suffer calumny and ridicule without being perturbed. But where was such an Awakener to be found ?

42. The long and lonely search for an answer to this ever-present question, his ponderings over the legendary roles of *Ibrāhīm* and *Mūsā* and *'Īsa* must have induced in him during the hot summer nights, with the holy city spread before him in the moonlight, visions of himself as the person most capable of filling this human void.

43. But, humility, they say, is the first attribute of genius. The moment he emerged from this deep reverie his humility must have re-asserted itself. How could he, a humble dreamer, assume the power of controlling and guiding his people as *Ibrāhīm* was said to have done ? How could he command the powers of speech which *Mūsā* himself had prayed for ? Where was he to find the magic words of Jesus that could transform lumps of inert clay into soaring birds freed from hunger and fear (Sura *Ál-i 'Imrān*, 3 : 49).

44. This struggle between an impelling urge and an innate humility has come down to us in different forms and versions. Through discriminating imagination alone can one discern what a glorious struggle that must have been. In the language of Sura *Qadr* (No. 97) describing the Night of Glory, we read :

> Verily, We had bestowed it
> in the Night of Glory
> The Night of Glory more gracious
> than a thousand moons
> When angelic revelations
> waft down by the Glory
> of their Lord
> In every way 'tis full of peace
> until the spreading
> of the DAWN !

45. That spreading of the Dawn was an answer to all his hesitating questions : The Oneness of the Creator, *that* was the explanation of all discernible phenomena ! It was the realization of this Oneness, accompanied by the resolve to subject all thought and speech and action to this realization, wherein lay the hope and salvation of man ! And lo ! it was he, yes even his humble self, who had been given this glorious vision with such vividness. It was now his duty to convey

proximity to this central Citadel, the holy sanctuary around which thousands gathered each spring and each autumn to garner what knowledge and guidance they could get, and acquire, through sale and barter, what necessities they could secure for their subsistence.

37. By and large, new ideas were conveyed only through word of mouth emanating from this central source. And for this to be effective the word of mouth had to be couched in the language of poetry—in words that had tendrils which cling to the mind, passages that had mnemonic values which made them unforgettable. It was this necessity that had developed the linguistic effectiveness of the Arab culture and had endowed social values to excellence in verbal expression.

C. The Prophet Is Ordained

38. It was in this milieu that Muhammad was born in about the year 570 of the Julian Calendar—the year known to the locals as 'the year of the elephant.' This was a year in which Mecca had received a deep shock but had been saved from conquest and humiliation through what seemed to be a miracle indeed. Abraha's hordes had approached Mecca to destroy the Sanctity enfolding the Ka'ba so that a sanctuary of their own might flourish without a rival. Miraculously, their aim had been frustrated and the portentious hordes had suddenly disappeared in the mist of history.

39. As a child, the Prophet-to-be must have heard mention of this miraculous event, and the legends that had grown around it, in awe and with wide open eyes. Did he, at this tender age, resolve to make the Ka'ba impregnable when he grew up ?

40. Perhaps, but what we do know with certainty is that in his youth he had joined, and later, perhaps led, a sort of 'eagles' band' to succour and aid the weak, the needy and the unprotected during the two annual Spring and Autumn pilgrimages to the Holy Sanctuary. History also records how, by mobilizing the representatives of the several tribes who claimed special rights over the holy shrine, he had raised a tribally cherished stone and placed it shoulder high in a wall of the Ka'ba when it was being reconstructed.

41. A thoughtful young man who had already earned the title of *al-Amīn*, 'the Trustworthy,' one who had had experience in trade both before and after his marriage to Khadija—a widow in prosperous circumstances—he had been chiselled by Divinity for the mantle of pro-

33. Apart from this intermittent insurgence, they were essentially the products of their environment. Outside the few towns like Mecca, Medina and Tā'if, they were basically nomads of the desert who moved their tents wherever search for pasture took their herds of sheep. The camel provided them transport, shelter, clothing, milk and even meat when needed. The date-palm shed its relished fruit for them in abundance. Wealth was reckoned in terms of the number of camels or date-palms which a clan possessed. They were, therefore, a carefree people—rugged, hardy and unmindful of tomorrow, hospitable to a fault and free with wine and women when freedom from hunger allowed them. The inflorescence of their culture was poetry.

34. What made change, restraint and circumspection difficult and well-nigh impossible was their idolatry, their worship of innumerable tribal deities, always tending to splinter them into groups and counteracting the institutions made to fuse them into a well-knit human community. Years before his call to prophethood, Muhammad, through his concern for his fellow beings and his lonely meditations, had clearly perceived this weakness among his people—the curse inherent in idolatry.

35. But human groups, or the collective egos that each group inherits from its preceding generations, become crystallized in what are called the religions of different peoples and all such crystallized groups are naturally averse to changing their habits of thought or action. Even today, most of us are apt to meet every need for change and reform with the old retort : "We found our fathers doing this and we shall go the way of our fathers," (*Baqara* 2 : 170 and in a dozen other verses). Fourteen hundred years ago, this obstinacy, this allergy to change for their own good, this incapacity to visualise the advantage of change for the better, was immensely more difficult to overcome.

36. Yes, it was for the enlightenment of his people, who remembered no Awakener having come to them before, that Muhammad had come as the Messenger, the Awakener, the Harbinger of glad tidings. As a background to his advent, it must also be remembered that, in spite of all the tribal moves and taboos mentioned earlier, tribal Arabia was governed by no central Authority. In those relatively primitive days and in a region where people were scattered far and wide there was no written code, no police, no militia, no judiciary, no legislature, not even petty kings to command obedience. The *Ka'ba* alone was their emblem of authority.† There were only elders of independent tribes who derived their prestige according to their respective

Now, logically, an intercalary *Nasi* should come between two years; therefore, its right place would be between the third and fourth of the sacred months mentioned above. But it is just this logical placement that raised a thorny question : Would this month of *Nasi*, intervening between two sacred months be itself inviolable or otherwise? If it was regarded as inviolable the number of inviolable months would either be raised to five, or, the *Muḥarram* following that inviolable *Nasī* would be deprived of its inviolability ! If it was not inviolable its being open to violence would break the continuity of a sacred period.

30. To deal with such recurring dilemmas, the *Qalammas* was given the choice of declaring the intercalary *Nasi* either to intervene between *Dhu'l Ḥajj* and *Muḥarram*, or to follow *Muḥarram*, that is for the *Nasi* to come *after* the three months of inviolability. This latitude enjoyed by the *Qalammas* provided him with a cultural weapon which he could wield in the favour of one tribe or another according to his own interests.

31. The reference to this latitude entrusted to the *Qalammas* is found in Sura *Bara'ah* (9 : 37) in the laconic style of the Qur'ān,
yuḥillūnahu 'āmman wa yuḥarrimūnahu 'āmman :

> "One year they announce it
> (the month following *Dhu'l Ḥajj*)
> as "secular" another year as "sacred"
> in order that they may conform to the
> prescribed number of the holy months;
> they sometimes make profane
> what Allah hath made holy !
> Appear to them as virtuous
> the evil of their ways.
> It is not Allah that doth guide
> these infidels. . .

32. It was this weak and fragile link that over and over again broke asunder and led to uncertainty as to whether pillage of the pilgrims returning from the *Ḥajj al Akbar* of the month of *Dhu'l Ḥajj* was permissible or taboo. This ambiguity whether to unsheath, or not dare to unsheath, invariably led to violence and bloodshed. All that was needed to justify this was some real or imaginary infringement of some tribal custom or taboo. In brief, the intercalary *Nasi* was both a blessing which kept the tribes together as well as a curse which often made the hasty and the impetuous to shed each other's blood, almost as if in play.

months of *Adar* and *Nisan* respectively. It was owing to this almost parallel intercalation in the chronology of the Jews and the Pagans that, even till the demise of the Prophet, there existed the following concurrences :

1. Muḥarram	=	Tishri	=	Kārtik	=	Sept-Oct
2. Rajab	=	Nisan	=	Vishak	=	Mar-Apr
3. Ramaḍān	=	Sivan	=	Ashad	=	Apr-May
4. Dhu'l Ḥajj	=	Elūl	=	Aswin	=	Aug-Sep

26. These parallels will show that the intercalation of the thirteenth adjusting month was by no means a calendrical pattern peculiar to the pagan Arabs and the Jews. In fact it was and continues to be a universal practice which the relative movements of the sun and the moon compelled all mankind to adopt throughout the east and the west until the duration of the solar year was established in Egypt by the annual flooding of the Nile.

27. Whether this discovery was carried from Egypt to Iran or whether the Iranians themselves discovered it through some other means, the fact remains that Egypt and Iran were the only regions of the world where a solar year, totally independent of the moon, had presumably been in vogue even before the commencement of what is known as the Christian era, and certainly in the period preceding the advent of Islam. It was only the pagan Arabs and the Jews, lying between these two great realms that had continued to observe the old calendar based on the moon but kept abreast with the solar cycle by means of intercalation. All these four cogwheels of culture dovetailed into each other, and constituted a machinery which ran more or less smoothly in spite of human weaknesses. A people, guided by such relatively advanced institutions of social control, could not have been as barbarous and iniquitous as our historians paint them.

28. There was, however, one fragile link in this cultural chain that bound the Arab tribes into a single people; paradoxically, this was the link that joined the third and the fourth cultural patterns which we have just mentioned : (a) the four sacred months, and (b) the intercalary *Nasi*.

29. The four sacred months, as already mentioned, consisted of

1. *Rajab*, oscillating over March-April;
2. *Dhu'l Qa'd*, July-August;
3. *Dhu'l Ḥajj*, Aug-Sept; the last month of the expiring year; and
4. *Muḥarram*, Sep-Oct; the first month of the new year.

23. A third basic means of social control is also confirmed by the Qur'ān in Sura *Baqara* (2:225 and 234), and also in Sura *Barā'ah* (9:2). There prevailed the ancient, unwritten but generally observed, tribal taboo against violence during one month of spring and three months of autumn—the periods of equable climate most conducive to economic activity and social intermingling. In a region of intensely hot days of summer, and biting cold nights of winter, there was relatively little mobility during the heights of both these seasons of extreme heat and extreme cold together covering six months. The imposition of non-violence in four out of the remaining six months of mobility served as an effective control over the impulsive and impetuous nature of the desert Arabs—the *A'rāb* of the Sura *Barā'ah* (9 : 33 and 48). Among these nomadic peoples raids against peaceful habitations were not infrequent, ('Sura '*Ādiyāt*' No. 100), and armed retaliation was, in ordinary times, a tribal duty. But, even if a man were to be faced with his own father's murderer, he did not dare to unsheath his sword if this encounter happened to be during the four Sacred Months (the *ashhur ul ḥurum*). This one-third of every year, two-thirds of the period of mobility, covered the one month of *Rajab* in spring and the three consecutive months of *Dhu'l Qa'd*, *Dhu'l Ḥajj* and *Muḥarram* in the autumn.

24. Their fourth cultural pattern contributing to a stable life-cycle was the intercalation of a thirteenth month, called *Nasī*, for the purpose of keeping their moon-calendar abreast with the solar cycle which governs all human, animal and vegetable life on earth. This adjusting process, everywhere and at all times, was too intricate a phenomenon for the majority of the people of any community to understand. During pre-Islamic and early Islamic times only the hereditary heads of the *Qalammas* family, based in Mecca, were adepts in this reckoning. Every second or third year, as dictated by the relative movements of the seasons—that is when the 1st of *Muḥarram*, their New Year, was about to fall more than a month before the corresponding season, the representative of the *Qalammas* family announced, at the end of the August Ḥajj, that the beginning of the next *Muḥarram* would be delayed by the intercalation of a moon-month—designated as *Nasi* —following the current *Dhu'l Ḥajj*.

25. Strange as it may seem, it is, literally, unknown to historians of Islam that this pagan intercalation of the adjusting thirteenth month of *Nasi* between *Dhu'l Ḥajj* (the last month of their year) and *Muḥarram*† (the first month of their next year), every time preceded a similar intercalation observed by the Jews between their last and first

Year commencing with the new moon of *Muḥarram*.

20. Again, at the time of the vernal equinox—21st March—there gathered the Minor Assemblage, their *Ḥajj al-Aṣg͟har*,† which was relatively a smaller gathering but coincided more or less with the *Passover* of the Jews, the *Easter* of the Christians, the *Now Roz* of Iran and the *Holī* of India.

21. The second feature of their culture was the intervening of their trade caravans between the two above mentioned religio-commercial assemblages. After the *Ḥajj al-Akbar* in August, a trade caravan made a tour to the south during winter and returned in time for the *Ḥajj al-Aṣg͟har* in Spring. After this Minor Assemblage in spring another trade caravan made a tour to the north in summer and returned long before the autumn equinox for the *Ḥajj al-Akbar*. These two seasonal caravans carried the Quraish, the merchant princes of Mecca, to most of the trade centres lying within reach of the means of travel then available—to Yemen and even Abyssinia in the south, to Jerusalem and Damascus, even Constantinople and, perhaps, Ctesiphon in the north. Both caravans enriched the mother city, Mecca, the locale of the Ancient Sanctuary, the *Bait al-'Atīq*.

22. The Qur'ān itself is witness to my above statements. Chronologically a very early Sura, entitled *Quraish*, (No. 106), throws a bouquet, by name, at this leading clan of pre-Islamic pagans by eulogizing this adjustment of their economic life with the seasons of the year, their *riḥlat ash shitā' waṣ ṣaif*—caravans of winter and summer, and the *īlaf*—the treaties they had entered into with the tribes of the north and the south for the guarantee of safety of life and commerce during their itinerant journeys. This Sura ends with the words *aṭ'amahum min jū'in wa āmanahum min khawf*, i. e., ' feeds them in hunger and insures them immunity from violence'. In other words, the people of Mecca—the locale of the Sanctuary—did not themselves have to labour for the production of their nourishment; they were fed by the tributary offerings brought to them by the tribes of the region and the tithes† levied on the goods and animals brought there twice a year for sale and barter during the two Pilgrimages of March and August respectively. In addition to this the inviolability of the *Ḥaram* provided them protection of life and property. It was this orbital functioning around a social nucleus, this synchronisation between the seasons of nature and the cycles of commerce, this inter-tribal understanding for peaceful co-existence and symbiosis that had contributed so much to the prestige of the Quraish as the guardians of the *Ḥaram*—the sacred sanctuary of Allah, the Deity Supreme, symbolized in the *Ka'ba*.

that in the course of these three evenings we shall see, as in a detective story, the gradual disentangling of a knot in the thread of time that has confused the academic sleuths for a millennium.

14. With this aim clearly in view we shall begin with a review of the cultural background in which commences the chronology of Islam.

B. The Foundations of Pre-Islamic Culture

15. Every writer mentioning early Islamic history—even non-Muslims—who generally limit their analyses to Muslim sources—paint the period immediately preceding the advent of Islam as inordinately dark. At most, the poetic talents of the pagan Arabs are sometimes given recognition.

16. This somewhat biased treatment of pre-Islamic times veils the cultural background of the *Sīrah* itself. It is this gap in history—this sudden change from the unrelieved black to the pure white—that hides for later generations the grey perspective in which the advent of Islam needs to be viewed.

17. The first step in reconstructing Islamic chronology, therefore, is to establish the fact that there were undoubtedly some aspects of pre-Islamic life and institutions of social control which, so to say, minimised friction and oiled the cogwheels of social existence. We are unaware of them because, despite some of them having continued to exist throughout the life-time of the Prophet, they, as we shall see later, went into oblivion immediately after his demise; no vestige of theirs remains even in Muslim memory.

18. The most outstanding, and almost deliberately effaced, feature of pre-Islamic pagan culture was its close synchronization with the seasons. Their new year began with the new moon of *Muḥarram* and coincided with the new moon of *Tishri* in the old Jewish calendar as well as the new moon of *Kārtik* in India; also, it commenced more or less with the autumnal equinox—22nd September of the Julian calendar.

19. The last month of their year, named *Dhu'l Ḥajj* commenced with the 'Ten Nights' culminating in the Festive Night so laconically pictured in the opening verses of the Sura *Fajr* (No. 79). Every year, in August that noisy night would follow the performance of the *Ḥajj al-Akbar* for which thousands assembled in Mecca from far and near. This pagan festival coincided with the *Dasehra* in both time and features; as in India, it was also followed twenty days later by the New

And, even today, the calendar of the Roman Catholic Church continues to be a priestly maze with its 'Advent', its 'Octaves', its 'Epiphany', its 'Lent', and its 'Pentecost'. At least all dates connected with Easter have yet to be emancipated from the phases of the moon.

10. The purely solar reckoning happened to be carried from Egypt, the land of the ancient Pyramids, to the capital of the pagan Roman Empire only about half a century **before** the estimated birth of Jesus. This proximity was merely a coincidence. But, when, more than a century later, Christianity found a foothold in Rome, this solar calendar, imported by Julius Caesar (J. C.), was appropriated and became almost an emblem of Jesus Christ (another J. C.). Paradoxically, it was the Christian Pope, Gregory XIII (1572-85) who, on the one hand, made this calendar more accurate and, on the other, transferred its New Year from March to January; it is owing to this that *September* (i, e., the seventh month) became the 'ninth', *October* the 'tenth', *November* the 'eleventh' and *December* the 'twelfth' month !

11. In the light of the industrial revolution of the 18th and 19th centuries, the scientific value of the purely solar reckoning, the so-called 'Christian' calendar, began to be appreciated and, despite the fumblings of the Christian church, the change from the moon to the sun, as the sole reckoner of the year, came to be interpreted as the outcome of a change from demonology to Christology. Today, this mix-up of two thousand years ago continues to inflate the ego of every Christian youth; it deflates, however little, the egos of all school children who do not happen to be Christians.

12. Happily for me, this is not a study involving the faith of Christianity, nor the faith of Islam. I have used the above illustration only to emphasize the importance of the solar reckoning of the year in comparison with the moon reckoning which goes back to the earliest and most primitive history of man. Similarly, I have based some of my statements on the Qur'ān; but even these are non-controversial. As far as possible I have avoided religious polemics as such; little room therefore will be found for controversy. What I present before you is more akin to the arithmetical 'rule of three', an algebraical analysis, a series of logical syllogisms rather than religious dogmas or their denials.

13. These lectures, in short, constitute an attempt at presenting before an audience of the intelligentsia an analysis of early Islamic history, and some chronological adjustments which are needed in the light of new findings in allied branches of knowledge. Let us hope

minating the Umayyads. Obviously, these accounts present the early history of Islam as the historians under the Abbasides saw it; perhaps, even as they wanted posterity to see it. Must we accept whatever they have said as final and unchangeable ? Is there no alternative for us but to see events in *their* particular perspective ? Suppose we are confronted with anomalies and contradictions : cannot information garnered subsequently in different branches of knowledge justify us in correcting their perspective of a past which was a past to them also ?

6. Such being the limitations of history, that branch of learning cannot always be trusted by itself; support for, and weaknesses in, its propositions must be sought for in allied branches of knowledge : geography, archaeology, climatology, linguistics, semantics, all these can help to evaluate history. The more such sciences develop and are made use of, the more accurate and trustworthy will be our history, more and more clear will the images of the past become.

7. To illustrate still more clearly what I mean, let me here give an actual example of how such historiology, such probing into allied sciences, can add new meaning to age-old impressions which we tend to take as unquestionable truths. Every schoolboy knows that this is the 1977th year of what has come to be known as the 'Christian' calendar. Naturally, he becomes certain that it is the 'Christian' element in this calendar which has taken mankind a step higher in the spiral of civilization, and opened new vistas for man's development; otherwise, why should this calendar be called 'Christian' ?

8. It is only historiological analysis which, reviewing the history of western civilization at a later stage, can arrive at the conclusion that, while the message of love and compassion brought by Jesus certainly served as a milestone in the history of the human race, it was a pagan, Julius Caesar, to whom we are indebted for his having introduced the purely solar calendar which gradually emancipated the millions of Europe from the vagaries of the moon-based calendars and provided a scale of time measurement by which human activity could be better synchronized with the seasons of our terrestrial sphere.

9. Jesus, or Christianity, had nothing whatsoever to do with its advent. On the contrary we find that, in spite of this sun calendar, it was the Christian church that had, more than a millennium later, persecuted Copernicus (d. 1543) and Galileo (d. 1642) for their findings on the subordinate place of the earth in relation to that of the sun.

LECTURE I

From Jāhiliya to Hijrah

A. Introduction : The Limitations of History

1. History is, essentially, an evaluation of the past in the light of the present; as the light of the present changes, becomes bright or dim, the image of the past too, changes with it.

2. Let me tell you a story that will illustrate to you the underlying theme of these lectures. A famous comedian was visiting his old college when the students happened to be answering their examination papers in history. He picked up a question paper and beamed at the students. "Exactly the same questions as had been put to me twenty years ago !" he exclaimed, "Even now I could get a first class !" "Yes," said the Principal who was taking him around, "but from time to time we expect different answers !"

3. You see what I mean ? History is not written once for all time. A particularly poignant experience illustrating this changeability of history once made even a prosaic like me break out into verse :

کل راگ کسی کا گاتی تھی، کل راگ کسی کا گائیگی
تاریخ بدلتی آئی ھے، تاریخ بدلتی جائیگی

4. Of course such anecdotes, like cartoons, exaggerate the points they want to emphasize. So, if there are students or professors of history amongst you, let me assure them that I am as much aware of the indispensability of history as of its weaknesses.

5. If you have read several versions of the early history of Islam you will appreciate the validity of the above remarks.† If histories had been compiled, say, in the lifetime of the Prophet himself, and were still extant, they would have given us a very different image of that formative period. As it happens, we have only the accounts left to us by Ibn Isḥāq, Wāqidī, Ibn Hishām and Ibn Sa'd, all compilers of the late second century when more than a hundred years had intervened and the Abbasides were consolidating themselves after eli-

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1977

Khuda Bakhsh Annual Lectures
are delivered every year
by some eminent scholar of
Persian, Arabic or Islamic
Studies.

Mr. Qazi Abdul Wadood,
Dr. Md. Zubair Siddiqui,
Prof. A. A. A. Fyzee,
Dr. Nazir Ahmad,
Dr. S. A. H. Abidi and
Dr. S. H. Askari
were the forerunners
in the series to which
Dr. Hashim Amir Ali
Contributed in 1977.

Khuda Bakhsh Annual Lectures Series –7

Upstream Downstream
Reconstruction of Islamic Chronology

by
Dr. Hashim Amir Ali
Hyderabad

Our Countributors :

Prof. Kalimuddin Ahmad. B.A. (Cantab.) (*b.* 1909)
Sri Krishnapuri, Patna-13 (see pp. 71-72 Urdu Section)

Dr. Hashim Amir Ali, M.A. Ph. D., Hyderabad (*b.* 1903)
Ex-Director Rural Institute, Jamia Millia, Delhi; Trustee of the Private and Religious Trusts of Nizam.
Wrote several books on the *Qur'an* and sociological themes, among them : *Student's Qur'an* : *An Introduction*; *The message of the Quran*; *Meos of Mewat* : His life-work, almost his mission, is *the discovery of the lost Islamic Calendar*.

Mr. Muhammad Yunus Khalidi
Secretary, Azad Memorial Academy, Bashishar Nath Road, Lucknow.

For others, see Journal I.

CONTENTS

Reconstruction of Islamic Chronology : Upstream Downstream ... 1
—Dr. Hashim Amir Ali

My Criticism : A Retrospect (Urdu) ... 1
—Prof. Kalimuddin Ahmad

An Early Urdu Journal, *Adeeb* of Firozabad (Urdu) ... 73
—Dr. A. R. Bedar

Notes & Addenda : Regarding Maulana Azad's Letter (Urdu) ... 103
—Mr. Md. Yunus Khalidi

Corrections & Additions : Library Catalogue Vol. I/151 *Diwan of Hafiz* (Urdu) ... 104
—Mr. Q. A. Wadood (Bar-at-Law)

Review : *Farhang-i-Asafiyah-3* (Urdu) ... 105
—Mr. Q. A. Wadood (Bar-at-Law)

Autograph Impressions--Leaves from the Visitors' Register of the Library : Sir C. V. Raman (Scientist), Sir J. C. Bose (Scientist), R. E. Mortimer Wheeler (Archaeologist) and Sir John Simon (Chairman Simon [illegible] Commission) ... 113

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the material preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or having any concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

3. Notes and Addenda, by way of corrections and additions to any information published in this Journal or in any publication of the Library e.g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

Rs. 15.00 per copy

Printers : Tara Press, Tripolia, Patna-7 & Label Litho Press, Patna-4
Publisher : Mahboob Husain, for Khuda Bakhsh O.P. Library, Patna.

Khuda Bakhsh Library

Journal

4

1978

Khuda Bakhsh Oriental Public Library,
PATNA-800 004
(INDIA)

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

No. 4

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
Patna